مجلس ادارت

۱. مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲. ڈاکٹر نذیر احمد

۳. ضیاء الدین اصلاحی

معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے

فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دوسو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈال

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈال

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ. کرا

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بن

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

* رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو
اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے۔
اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائیگی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۳ ماہ رجب المرجب ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۹ء عدد ۵

فہرست مضامین

تاریخ فقہ اسلامی

از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

یہ کتاب "تاریخ التشریع الاسلامی" مولفہ علامہ محمد الخضری کی تصنیف کا سلیس و شگفتہ ترجمہ ہے جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بہ تفصیل بیان کی گئی ہیں۔ اس کا پرانا ایڈیشن ختم ہوگیا تھا۔ جدید ایڈیشن کمپیوٹر سے کتابت شدہ حوالوں کی تصحیح و مراجعت کے ساتھ نہایت اہتمام سے شایع کیا گیا ہے۔

قیمت ۱۲۵ روپے

شذرات

آزادی کے بعد اردو پر بڑا سخت وقت آیا، طرح طرح کے اتہام اس پر عائد کئے گئے، اب اگرچہ یہ حالات نہیں رہے اور اس پر عائد کردہ الزامات کی شدت میں بھی کمی آگئی ہے اور اردو کی سخت جانی نے اس کا گلا گھونٹنے والوں کو مایوس کردیا ہے کہ وہ ختم نہیں ہوسکتی، شروع میں اتر پردیش میں کانگریسی حکومتوں کی کوشش تو یہی تھی کہ ایسی صورت پیدا کردیں کہ چالیس برس بعد وہ خود بخود ختم ہوجائے اور نئی نسلیں اس سے ہمیشہ کے لئے بے گانہ ہوجائیں مگر جب اردو یہ سارے ظلم وستم جھیل گئی اور آج وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کا افق مزید وسیع ہوگیا ہے اور وہ ایشیا اور یورپ کے ملکوں تک پھیلتی جارہی ہے اور ہر جگہ سے یہی صدا بلند ہورہی ہے کہ ع سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ تو کانگریس والوں کی طرح بی۔ جے۔ پی کے لوگ بھی چاہے اس سے کتنا ہی بیر کیوں نہ رکھتے ہوں اس کی شیرینی، لطافت اور ہر دل عزیزی کا گن گارہے ہیں۔

اب اردو والوں کو اس کا واویلا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ مٹ رہی ہے، اس سے اردو کے شیدائیوں اور کارکنوں کی حوصلہ شکنی اور نئی نسل کی بے رغبتی بڑھتی ہے مگر اردو کے معاملے میں مطمئن اور غافل ہونا کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ اس کے مخالفوں کی ذہنیتیں تبدیل اور حکومتوں کا معاندانہ رویہ بدلا نہیں ہے، اتر پردیش میں اردو کا حال تمام ریاستوں سے بدتر ہے، یہاں اس کو اپنی بقا وتحفظ کے لئے بڑی لڑائی لڑنی پڑے گی۔ حکومت اردو کے لئے کسی سہولت کا اعلان کرتی ہے تو افسر شاہی اس پر عمل پیرا نہیں ہونے دیتی اور اس کے نفاذ میں طرح طرح کی رخنہ اندازی کرتی ہے اور پھر وہ سہولت ہمیشہ کے لئے سرد خانے میں چلی جاتی ہے، ریاستی اور مرکزی حکومتیں اردو کے معاملے میں مخلص اور سنجیدہ نہیں ہیں، ان کا ہر اقدام سیاسی ہوتا ہے، اردو کے فروغ اور مفاد سے زیادہ ان کو اپنی پارٹی کا مفاد عزیز ہوتا ہے، وہ اردو کو بھی اپنے کارکنوں اور پارٹی والوں کے فائدے کا ذریعہ بناتی ہیں، اس کی ایک مثال مختلف ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں کے عہدداران اور مختلف کمیٹیوں کے ارکان کی نامزدگی ہے، اتر پردیش میں نرائن دت تیواری کے علاوہ سارے وزرائے اعلی

نے اکیڈمی کے ارکان کا انتخاب سیاسی بنیادوں پر کیا ہے، اردو کے مشہور نقاد شمس الرحمن فاروقی کا انتخاب بہت مناسب تھا لیکن حکومت اس میں مخلص نہ تھی اس لئے ان کے خط کا جواب بھی نہ دیا اور ان کو مستعفی ہوجانا پڑا۔

اس وقت اردو کی بقا وتحفظ کے ضامن عربی مدارس بھی ہیں جن میں ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہے، وہ ادارے جو اردو کی کتابوں کی تالیف وتصنیف اور طبع واشاعت کا کام برابر انجام دے رہے ہیں اور بہت سے فضلا اور دانش ور جن کی گھٹی میں اردو کی محبت رچی بسی ہوئی ہے اور وہ برابر علمی تحقیقات اور ادبی خدمات میں مصروف اور اردو کے مسائل سے باخبر ہوکر اسے فروغ دینے کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں، ان سب کو اس لئے ناقابل التفات سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں ہوتے، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور مخصوص قسم کے ناقدین ومحققین اور ادیبوں وصحافیوں کی نامزدگی پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا لیکن اردو زبان پر ان کی اجارہ داری تو نہیں ہے جب کہ عام طور پر ان کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا جارہا ہے کہ اردو کی بدولت شہرت وترقی پانے اور اسی پر ان کی معیشت کا دارومدار ہونے کے باوجود ان کو اس کی خدمت وفروغ سے نہ دلچسپی ہوتی ہے اور نہ وہ اس کے لئے کوئی قربانی دیتے ہیں بلکہ اپنے بچوں کے "روشن مستقبل" کے لئے انہیں اردو تعلیم بھی نہیں دلاتے، عربی مدارس میں اردو ذریعۂ تعلیم تو ہے مگر مدارس سے وابستہ اکثر لوگوں کی نظر اس کی تاریخ، ادب اور شاعری پر نہیں ہوتی کیوں کہ اس کی تعلیم نہیں دی جاتی، جدید علوم وفنون کا کوئی جھونکا بھی مدارس میں نہیں آنے دیا جاتا کہ اس سے ان کا اصل مقصد ہی فوت ہوجائے گا اور طالب علم سائنس اور ریاضی کی بھول بھلیوں میں پڑکر دینی علوم میں دستگاہ نہیں پیدا کرسکتا۔ مگر یہ علحدہ موضوع ہے جس پر سر دست گفتگو مقصود نہیں۔

اردو کے معاملے میں مایوسی اس لئے بھی بیجا ہے کہ ہندوستان میں اردو کی بہ کثرت کتابیں، اخبار اور رسالے شایع ہورہے ہیں، متعدد ادارے معیاری اور محققانہ کتابیں چھاپ کر اس کی بقا کا سامان کررہے ہیں،

دارالمصنفین کا نام لینا خودستائی ہوگی، مکتبہ جامعہ دہلی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، بعض ریاستی اردو اکادمیاں اور مذہبی و دعوتی کتابوں کی اشاعت کے لئے ادارۂ تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ اور مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی بڑے مرکز ہیں، ہم کو اس موقع پر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کا ذکر کرنا ہے جو مشرقی علوم اور اردو، فارسی، عربی مطبوعات و مخطوطات کا بڑا مخزن ہے۔ وہ نایاب، نادر اور بھولی بسری کتابیں شایع کر کے لوگوں کو محو حیرت بنائے ہوئے ہے۔ حال ہی میں اس کے موجودہ ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمٰن چغانی نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے خطبات، خطوط اور تقریروں کے مجموعے شایع کئے ہیں جن کی تعداد چھ[۶] ہے ان کے علاوہ قدیم تذکرے و تالیفات اور نئی تصنیفات بھی سات عدد موصول ہوئی ہیں۔ ہم اس کے لئے چغانی صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں۔

تفسیر اور قرآنی علوم و معارف کے سلسلے میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ گو وہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر نہیں لکھ سکے تاہم قرآنیات میں بڑی اہم مصنفات کے علاوہ بعض متفرق سورتوں کی ۷ تفسیریں شایع ہو چکی ہیں ان سے ان کے علمی تبحر، مجتہدانہ انداز فکر اور قرآن مجید میں غواصی کا پتہ بخوبی چلتا ہے، ان کی تصنیفی زبان عربی تھی، ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے ان کے تفسیری رسائل کا سلیس اور شگفتہ اردو ترجمہ کر کے پہلے متفرقاً شایع کیا پھر پاکستان سے ان کو یکجا کر کے "مجموعۂ تفاسیر فراہیؒ" کے نام سے شایع کیا، لیکن یہ ہندوستان میں دستیاب نہ تھا، اس لئے دائرۂ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ نے بھی اس کو "تفسیر نظام القرآن" کے نام سے شایع کیا ہے، ہندوستان سے شایع ہونے والے اس دوسرے ایڈیشن میں جزوی اضافہ بھی ہے، ۴۳۰ صفحات کی اس مجلد (مع گرد پوش) کتاب کی قیمت ۱۰۰ روپے ہے، مولانا کی مشہور تصنیف "الرای الصحیح فیمن هو الذبیح" کا بہت اچھا اور محقق اڈیشن دارالقلم دمشق سے شایع ہوا ہے، جس میں ڈاکٹر محمد اجمل کا مقدمہ خاصے کی چیز ہے، قیمت درج نہیں ہے، اسی کتاب کا اردو ترجمہ "ذبیح کون ہے" دائرۂ حمیدیہ سے ۸۰ روپے میں مل سکتا ہے، اور مولانا کی عربی تصنیف حکمت قرآن کا اردو ترجمہ بھی ۴۰ روپے میں مل سکتا ہے، ان اہم کتب کی اشاعت اور مفید قرآنی خدمت کے لئے دائرۂ حمیدیہ تحسین کا مستحق ہے۔

مقالات

سورج کی موت اور قیامت

قرآن، حدیث اور سائنس کی نظر میں۔

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی٭

اسلامی عقائد میں توحید اور رسالت کے بعد یوم آخرت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ان ہی عقائد کے اثبات سے انسانی کردار و کیرکٹر کی درستی عمل میں آتی ہے۔ یوم آخرت یا قیامت کا عقیدہ ایک ایسا تصور ہے جو انسان کو قابو میں رکھ سکتا ہے، جس کے مطابق ہر انسان کو اس کے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔

اسلام کی ایک پیش گوئی

اسلامی عقائد ادعائی یا دقیانوسیت کی نشانی نہیں بلکہ وہ حد درجہ علمی و عقلی ہیں، جن کی صداقت پر نظام کائنات گواہ ہے۔ چنانچہ اسلامی عقائد اور تعلیمات کی تصدیق و تائید جدید ترین انکشافات کے ذریعہ مسلسل ہو رہی ہے جو اس بات کا واضح اور ناقابل تردید علمی و سائنٹفک ثبوت ہے کہ یہ پوری کائنات اسی علیم و خبیر اور لازوال ہستی کی پیدا کردہ ہے جس نے نبی آخر زماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ایک بے نظیر اور معجزانہ کتاب بھیجی ہے، جو اس کائنات کے ایسے "بھیدوں" پر مشتمل ہے جن کو چودہ[۱۴] سو سال پہلے کوئی بھی انسان نہیں جانتا تھا اور ان بھیدوں میں سے ایک بھید سورج کی "موت" اور وقوع قیامت کا نظارہ ہے۔ چنانچہ نہ صرف قرآن عظیم میں سورج اور ستاروں کی "طبعی" موت کی پیش گوئی واضح انداز میں مذکور ہے،

٭ جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ و چیرمین دارالشریعہ، بنگلور۔

بلکہ حدیث نبوی میں اس کی شرح و تفصیل بھی وارد ہوئی ہے۔ نیز صدیوں پہلے مفسرین اور راویانِ حدیث نے بھی اس قرآنی پیش گوئی کا صحیح صحیح مفہوم بیان کرکے اس نظریہ و عقیدے کو مزید مستحکم کردیا ہے۔

نظامِ کائنات کی گواہی

چنانچہ اب چودہ سو (۱۴۰۰) سال بعد جدید سائنس اور اس کے انکشافات نے ہوبہو وہی مفہوم بیان کرکے اسلامی عقائد و تعلیمات کی صحت و صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کردی ہے اور یہ بڑی ہی ایمان افروز کہانی ہے، جس کے ملاحظے سے اسلام کے مذکورۂ بالا تینوں بنیادی عقائد علم و عقل کی روشنی میں صحیح ثابت ہوتے ہیں اور الحاد و مادہ پرستی کی تردید ہوتی ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کے ملاحظے سے ثابت ہوتا ہے کہ:

۱۔ یہ کائنات کوئی الل ٹپ یا اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک خالق اور رب بھی ہے جو اس کائنات کے تمام اسرارِ سربستہ سے واقف ہے اور یہی خدائے ذوالجلال ہے۔

۲۔ خالقِ کائنات نے چونکہ اپنی تخلیقات کے اندرونی رازوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے انہیں اپنی کتابِ حکمت میں چودہ سو (۱۴۰۰) سال پہلے ہی محفوظ کردیا ہے، جن کی تائید و تصدیق انکشافاتِ جدیدہ کے ذریعہ ہو رہی ہے، لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب (قرآن عظیم) برحق ہے اور وہ اسی ہستی کی جانب سے نازل شدہ ہے جس نے یہ رنگا رنگ کائنات بنائی ہے۔ ورنہ اس قدر لازوال سچائیاں ظہور میں نہ آتیں۔

۳۔ قرآن عظیم جس ہستی پر نازل ہوا وہ خدا کے سچے رسول تھے جنھوں نے کلامِ الٰہی کو بے کم و کاست انسانوں کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی، بلکہ جو کچھ بھی کہا وہ وحیِ الٰہی کی بدولت کہا۔

رونگٹے کھڑا کردینے والی داستان

اس اعتبار سے توحید، رسالت اور یومِ آخرت

کے اثبات کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا کلامِ الٰہی ہونا بھی سائنٹفک نقطۂ نظر سے ثابت ہوتا ہے۔ نیز اس بحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ عالمِ رنگ و بو ایک زبردست اسکیم اور پوری منصوبہ بندی کے تحت وجود میں آئی ہے اور ایک مکمل پلان کے تحت جاری و ساری ہے۔ چنانچہ اس موقع پر سورج کی "طبیعی موت" پر جو وقوعِ قیامت کی ایک واضح علامت ہے، جدید ترین سائنسی تحقیقات کا ایک جائزہ پیش کیا جائے گا اور پھر قرآن و حدیث کے ابدی حقائق اور مفسرین و محدثین اور راویانِ حدیث کی تشریحات پیش کی جائیں گی، جن سے یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح سامنے آئے گی کہ ان سب کا تال اور سر ایک ہی ہے۔ نیز یہ کہ قرآن اور حدیث میں سورج اور چاند ستاروں کی موت اور اختتامِ کائنات کے بارے میں ایسے زبردست انکشافات موجود ہیں جو رونگٹے کھڑا کردینے والے ہیں۔

چاند اور سورج باضابطہ و بارفتار

یہ کائنات بخت و اتفاق کے تحت وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کا ایک خالق و ناظم ہے جس نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ اسے وجود بخشا ہے۔ چاند، سورج اور ستارے اس کائنات میں باضابطہ طور پر رواں دواں ہیں۔ اس سلسلے میں ایک سائنٹفک حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حیوانات و نباتات پیدا ہوتے ہیں پھر جوان ہوتے ہیں اور پھر بوڑھے ہوکر مر جاتے ہیں، بالکل اسی طرح چاند ستارے بھی پیدا ہوتے پھر جوان ہوتے اور پھر بوڑھے ہوکر ختم ہوجاتے ہیں۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اسی لئے قرآن حکیم میں چاند، سورج اور ستاروں کی ماہیت اور ان کے ضوابط میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ — اور اس نے تمہارے لئے دن رات

وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ — اور چاند سورج کو رام کردیا ہے اور

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۔ (نحل: ۱۲)

ستارے بھی اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ ان مظاہر میں عقل والوں کے لئے کافی نشانیاں موجود ہیں۔

اس سلسلے میں ایک دوسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ چاند اور سورج ایک مقررہ مدت یا ایک حسابی ضابطے کے تحت چکر کاٹ رہے ہیں، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:

يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (فاطر: ۱۳)

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ اور اسی نے سورج اور چاند کو قابو میں کر رکھا ہے (چنانچہ) ہر ایک ایک مقررہ مدت کے مطابق دوڑ رہا ہے۔ یہی ہے تمہارا رب اور اسی کے لئے ہے (اس کائنات کی) پوری بادشاہی۔

اس موقع پر "اجل مسمی" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ لفظ "اجل" کے معنی مقررہ مدت کے ہیں (المدة المضروبة للشئ)[۱] اور "مسمی" کے معنی بھی مقرر کردیا محدود کے آتے ہیں۔ (مسمی الاجل: عینہ، وحددہ)[۲]

اس لحاظ سے اس میں مزید تاکید پیدا ہو گئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مدت جو بالکل مقررہ ہو اور اس مقررہ مدت کے دو مفہوم یا دو مصداق ہو سکتے ہیں (۱) چاند اور سورج دونوں ایک مقررہ حساب سے چل رہے ہیں۔ (۲) یہ دونوں ایک مقررہ مدت تک چلتے رہیں گے پہلی صورت میں لفظ "یجری" حال کے معنی پر دلالت کرنے والا ہوگا، جیسا کہ اوپر مذکور سورۂ فاطر کی آیت سے ظاہر ہو رہا ہے اور دوسری صورت میں وہ مستقبل کے معنی پر دلالت کرنے والا ہوگا،

جیسا کہ حسب ذیل آیت سے ظاہر ہوگا:

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُم بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ (رعد: ۲)

اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ (چنانچہ ان دونوں میں سے) ہر ایک مقررہ وقت تک چلتا رہے گا۔ وہ معاملے کی تدبیر کر رہا ہے اور اپنی نشانیوں کو کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کر سکو۔

اس موقع پر "وقت مقررہ" سے مراد "یوم موعود" ہے۔ کیونکہ اس کے بعد جو تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں وہ وقوعِ قیامت پر دلالت کر رہی ہیں: (۱) وہ پورے معاملے (نظام کائنات) کی تدبیر کر رہا ہے (۲) وہ اپنی نشانیوں کو (جو وقوعِ قیامت سے متعلق ہیں) کھول کھول کر بیان کر رہا ہے (۳) تاکہ تم اپنے آقا سے ملنے کا یقین کر سکو۔ یعنی وقوعِ قیامت کی سچائی کا نظارہ پورے یقین کے ساتھ کر سکو۔ چنانچہ اس موقع پر وقوعِ قیامت سے متعلق جن نشانیوں کے ظہور کی پیش گوئی کی گئی ہے وہ جدید ترین سائنسی تحقیقات واکتشافات کے باعث کھل کر سامنے آگئی ہیں۔ لہٰذا اب اگلی سطور میں ان پر بحث کی جائے گی۔

وقوعِ قیامت سائنس کی نظر میں

سائنسی نقطۂ نظر سے ہمارے سورج جیسے ستارے بھی جیتے اور مرتے رہتے ہیں۔ ہماری اس کائنات میں اربوں کہکشائیں (ستاروں کی جھرمٹ) موجود ہیں۔ ہماری کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے تقریباً ایک کھرب ستارے موجود ہیں۔[۳] کہکشاؤں اور ستاروں کی یہ تعداد محیر العقول ضرور ہے مگر یہ کوئی افسانہ نہیں ہے۔ ماہرینِ فلکیات جدید ترین دوربینوں کے ذریعہ لاکھوں نوری سال کے فاصلے پر واقع کہکشاؤں کا نظارہ کر کے ان کی واضح

تصویریں اتار چکے ہیں۔ سورج اور دیگر ستارے ہائیڈروجن گیس کے بنے ہوئے ہیں جو ایک جلنے والی گیس ہے اور سورج کے بطن میں ڈیڑھ سے دو کروڑ ڈگری درجۂ حرارت پائی جاتی ہے اور اس زبردست تپش کی بدولت اس کی ہائیڈروجن گیس مسلسل جلتے ہوئے ایک دوسرے عنصر ہیلیم میں تبدیل ہوتی جارہی ہے جو جلنے کے قابل نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت راکھ کی طرح ہے، جو کسی چیز کے جلنے کے بعد باقی رہ جاتی ہے۔ سورج درحقیقت ایک چراغ کی طرح ہے، جس کا "ایندھن" ہائیڈروجن گیس ہے۔ سورج کی روشنی اور اس کی حرارت اسی کے جلنے کی بدولت پیدا ہوتی ہے اور جب یہ ایندھن ختم ہوجائے گا تو چراغ بھی بجھ جائے گا۔[۵] اب ظاہر ہے کہ اس کا سارا ایندھن ایک نہ ایک دن ضرور ختم ہو کے رہے گا، تب وہ بالکل سرد اور "بے جان" ہو کر ایک طرف لڑھک جائے گا اور یہ اس کی "موت" ہوگی۔ سائنس کی اصطلاح میں ایسے ٹھنڈے یا "مردہ" ستارے کو "سفید بونا" یا "وہائیٹ ڈوارف"[۶] کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سورج درحقیقت ایک بہت بڑا "تھرمل پلانٹ" ہے جو انسان کی خدمت بھی کر رہا ہے اور اسے ایک آنے والے دن کی خبر بھی دے رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک روسی سائنس داں جارج گیمو جس نے بعد میں امریکہ کی شہریت اختیار کر لی تھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہی "سورج کی پیدائش اور موت"[۷] ہے۔ چنانچہ اس نے سورج کی "طبیعیات" پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ سورج کے اندر بہت بھاری مقدار میں ہائیڈروجن گیس موجود ہے، جو مسلسل ہیلیم میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ بالآخر اس کی پوری ہائیڈروجن جل جائے گی، تب اس کا تھرمونیوکلیری ایکشن بند ہوجائے گا اور وہ ایک بے حد ٹھنڈے جسم میں تبدیل ہوجائے گا۔

The sun has a larger percentage of hydrogen gas in its atmosphere which will be continually converted into helium. Eventually allhydrogen is going to be burnt up

when the thermonuclear reaction will be ceased. It will him into an immensely cold body.[۸]

اور اب یہ دنیائے سائنس میں ایک "حقیقت" بن چکی ہے۔ کیونکہ یہ چیز "طبیعی" اور "حسابی" نقطۂ نظر سے ایک حتمی صداقت نظر آرہی ہے اور اس حقیقت کو ہر سائنس داں صحیح تصور کرنے پر خود کو مجبور پا رہا ہے۔ چنانچہ دنیا کے سب سے بڑے "دائرۃ المعارف" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس حقیقت کا اعتراف اس طرح موجود ہے:

"سورج کے مستقبل کا ارتقا بھی اسی طرح متوقع ہے جس طرح دوسرے عام ستاروں میں ہوتا ہے۔ آخر کار پوری ہائیڈروجن جل کر ختم ہوجائے گی اور ہیلیم اور دیگر وزنی جوہروں کا نیوکلیائی تعامل شروع ہوجائے گا۔ اس کے نتیجے میں سورج کی کیمیائی ساخت بدل جائے گی اور اس کی روشنی میں اضافہ ہوجائے گا۔ اس طرح وہ ایک "سرخ دیو"[۹] بن جائے گا۔ ارتقائی اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورج کو اس حالت تک پہنچنے کے لئے ایک ارب سال درکار ہوں گے۔ آخر کار جب نیوکلیائی توانائی کے سارے ذرائع ختم ہوجائیں گے تو سورج اپنی آخری ارتقائی منزل تک پہنچ کر ایک "سفید بونا" بن جائے گا، یعنی ایک چھوٹے دائرے والا ستارہ۔"

The future evolution of the sun is expected to be similar to that of other normal stars. Eventually all hydrogen will be burned up and nuclear reactions involving helium and heavier atoms will take over. This will change the chemical composition of the sun; as a result, the sun will increase in luminosity and thus turn into a red giant. Computations on evolutionary models predict that in a few times 10 years the sun will reach the red giant stage.

Finally, when all nuclear energy sources are used up. the sun will reach its last evolutionary stage: that is : it will become a white dwarf. a star of small radius

اس موقع پر یہ جو کہا گیا ہے کہ سورج کی "حیات مستعار" کے ابھی ایک ارب سال باقی ہیں، تو بات سورج کے جسم میں موجود ہائیڈروجن کی مقدار کے پیش نظر ہے کہ وہ جس رفتار سے اپنا "ایندھن" (ہائیڈروجن) کھوتا جارہا ہے اس کے پیش نظر اس کے ایندھن کو ختم ہونے میں ابھی اتنا عرصہ لگے گا۔ مگر یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ سورج ایک ارب سال سے پہلے ختم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خود سائنس دانوں ہی کی تحقیقات کے مطابق ہمارے سورج جیسے بعض ستارے پُراسرار قسم کے دھماکوں سے پھٹتے رہتے ہیں۔ اس طرح پھٹنے والے ستاروں کو "حادث ستارے" (نووے) کہا جاتا ہے اور ہماری کہکشاں میں ہر سال اس قسم کے تیس ستارے پھٹتے رہتے ہیں:

About thirty nova outburts are though to occur each year m the the Galaxy

اور یہ وہ تماشائے ربوبیت ہے جس کا آج سائنس داں اپنی طاقتور دوربینوں کے ذریعہ "مشاہدہ" کر رہے ہیں اور اس اعتبار سے ہمارا اپنا سورج بھی کسی دن ایک حادث ستارہ (نووا) بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں خود جارج گیمو نے اس کا امکان ظاہر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ہمارا سورج بھی کسی دن اچانک ایک حادث ستارے کا روپ دھار کر ایک لطیف گیس میں تبدیل ہو سکتا ہے اور یہ سب کچھ اتنی سرعت کے ساتھ ہوگا کہ کسی کو بھی محسوس نہ ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہاں البتہ اگر کسی بعید ترین نظام شمسی کے کسی سیارے پر بیٹھے ہوئے کچھ ماہرین فلکیات اپنی دوربینوں کے ذریعہ ہمارے سورج پر نگاہ ڈالیں گے تو وہ دیکھیں گے کہ ایک حادث ستارہ نمودار ہوا ہے۔

If. one fatal day. our sun should choose to become nova. the earth (and all the other planets as well) would

instantly be turned into a then gas. and it all would take place so fast that nobody would ever have time to realize what happened. Only the astronomers. it there are any on some distant planetary system of another star

ایک عظیم قرآنی انکشاف

سورج کی پیدائش اور موت کی یہ پوری داستان جس کو دنیائے سائنس نے بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے، اس کا انکشاف قرآن عظیم کے ذریعہ روز اول ہی میں ایک علمی پیش گوئی کے طور پر اس طرح کر دیا گیا تھا:

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۔ (تکویر: ۱-۲)

(ایک وقت آئے گا) جب سورج بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے جھڑ پڑیں گے۔

اس موقع پر پہلی آیت میں سورج کی "بے نوری" یا اس کی موت کی خبر دی گئی ہے اور دوسری آیت میں کائنات کے اختتام کی پیش گوئی کی گئی ہے، جس کے نتیجے میں قیامت واقع ہوگی۔ چنانچہ پہلی آیت کی حقیقت اوپر مذکور سائنسی انکشافات کے تحت بخوبی ظاہر ہو چکی ہے۔ سورج کی یہ موت ظاہر ہے کہ ہمارے پورے "نظام شمسی" کی موت ہوگی۔ کیونکہ جب سورج ہی نہیں رہے گا جو روشنی، حرارت اور زندگی کا منبع ہے تو اس کے تابع سیاروں (جیسے عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری اور زحل وغیرہ) کا وجود بھی باقی نہ رہ سکے گا۔ اس اعتبار سے مجرد سورج کا اختتام نظام شمسی میں موجود تمام مخلوقات کے لئے قیامت کا دن ہوگا۔

اور دوسری آیت کے کئی مطالب ہو سکتے ہیں: اول یہ کہ ہماری کہکشاں (ملکی وے) کے تمام ستارے و سیارے آپس ہی میں ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی باہمی جذب و کشش (گراویٹیشن) کو ختم کر کے انہیں بکھیر دے گا۔ سوم یہ کہ یہ پوری کائنات جو اربوں کہکشاؤں اور کھربوں ستاروں پر مشتمل ہے (جیسا کہ انکشافات جدیدہ کے تحت یہ بات پوری طرح محقق ہے)

وہ پوری کی پوری آپس ہی میں ٹکرا کر ختم ہوجائے گی اور یہ بات موجودہ "نظریۂ عظیم دھماکہ" (بگ بینگ تھیوری) کی رو سے بہت ممکن نظر آتی ہے اور حسب ذیل آیت کریمہ میں غالباً اسی قسم کے نظریہ کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے:

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ۔ (انبیاء: ۱۰۴)

جس دن کہ ہم آسمان کو (اس کے تمام اجرام سمیت) اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح کہ مکتوبہ اوراق کا طومار لپیٹا جاتا ہے، جس طرح ہم نے (اس کائنات کی) تخلیق اول کی ابتدا کی تھی، اسی طرح اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ہمارے ذمہ ایک وعدہ ہے اور ہم اسے ضرور پورا کریں گے۔

قرآن، حدیث اور سائنس کی مطابقت

موجودہ سائنسی نظریات کی روشنی میں اس قسم کے حقایق کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے۔ ورنہ قدیم نظریات کی روشنی میں اجرام سماوی کی گردش اور ان میں موجود باہم جذب و کشش کا مفہوم واضح نہیں تھا۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ جدید نظریات و اکتشافات سے بے خبر ہمارے قدیم علماء و مفسرین نے بھی بالکل وہی مفہوم بیان کیا ہے جو جدید اکتشافات سے مطابقت رکھنے والا ہے اور اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تازہ اکتشافات ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں رہے، بلکہ اس قسم کے حقایق قرآن تو قرآن خود احادیث و روایات تک میں بھی بھرے ہوئے ہیں اور اس قسم کے حقایق و معارف کے ملاحظے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف قرآن عظیم سے مطابقت رکھنے والے ہیں بلکہ جدید ترین سائنسی

تحقیقات سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور اس اعتبار سے آج قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثِ نبوی کی صداقت اور اس کا اعجاز بھی ثابت ہو رہا ہے۔ نیز اس بحث سے راویان حدیث اور قدیم مفسرین کی صدق و سچائی پر بھی ایک نئی روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے تحقیقاتِ جدیدہ سے یکسر ناواقف ہونے کے باوجود پوری ایمانداری کے ساتھ وہی مفہوم ایک "علمی امانت" کے طور پر بیان کردیا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین سے منقول ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ جس سورہ میں سورج کی بے نوری یا اس کی موت کی خبر دی گئی ہے اس کا نام ہی "تکویر" رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی سورج کی "بساط الٹنا" یا اس کا "بوریا بستر گول کرنا" جو اختتامِ کائنات کی علامت ہے۔ اسی طرح قرآن کے آخری پارہ میں اس سلسلے کی مزید دو سورتیں موجود ہیں جو وقوعِ قیامت پر سائنسی نقطۂ نظر سے نوع انسانی کو متنبہ کرنے والی ہیں اور وہ ہیں سورۂ انفطار اور سورۂ انشقاق اور ان دونوں میں بھی "ستاروں کی موت" اور اختتامِ کائنات کی خبر دی گئی ہے اور اس اعتبار سے یہ تینوں سورتیں جو مختلف الفاظ و اسالیب میں ہیں، ایک ہی مضمون اور ایک ہی حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں:

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (انفطار: ۱-۲)

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے بکھر جائیں گے۔

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (انشقاق: ۱)

جب آسمان پھٹ جائے گا۔

چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کسی کو قیامت کا دن اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے خوشی ہوتی ہو تو اسے چاہئے کہ وہ "إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ" اور "إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ" اور "إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ" پڑھے[۱]۔

ظاہر ہے کہ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو کائنات کے اندرونی بھیدوں سے واقف ہو۔ ورنہ

مستقبل میں پیش آنے والے علمی حقائق کے پیش نظر ماضی بعید میں کوئی صحیح اصول باضابطہ بیان کرنا ممکن نہیں ہوسکتا اور ضابطہ بھی کیسا؟ وہ جو قرآن کی مختلف آیات اور اس کے مختلف الفاظ کو ایک لڑی میں پرونے والا ہو! اس اعتبار سے قرآن تو قرآن خود حدیث کی بھی صحت و صداقت ثابت ہوتی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی "سرچشمۂ علم" سے صادر شدہ ہیں ورنہ ان دونوں میں اتنی زبردست مطابقت ہرگز نہ پائی جاتی۔

حدیث کی جانچ کا ایک نیا اصول

واضح رہے کہ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے "حسن غریب" کہا ہے، جب کہ امام حاکمؒ نے اسے "صحیح" قرار دیا ہے اور امام ذہبیؒ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے[17]۔ مگر موجودہ دور میں کسی حدیث کی "صحت" جانچنے کا صحیح اصول یہ ہونا چاہیے کہ وہ عقلی اور علمی اعتبار سے یا تو قرآن سے ہم آہنگ ہوجائے یا قرآن اور جدید تحقیقات اور اکتشافات کے مطابق ہوجائے۔ چاہے اس کی روایتی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح بہت سی "ضعیف" حدیثیں بھی اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے صحیح ثابت ہوسکتی ہیں جن میں "تاریخی" اعتبار سے کچھ "خامی" رہ گئی ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک اصول خود احادیث ہی میں اس طرح موجود ہے:

اعرضوا حدیثی علی کتاب اللہ فان وافقہ فہو منی وانا قلتہ[18]	میری حدیث کو کتاب اللہ پر پیش کرو اگر وہ اس کی موافقت کرے تو وہ میری بات ہے اور اسے میں نے کہا ہے۔
ستکون عنی رواۃ یروون الحدیث فاعرضوہ علی القرآن فان وافق القرآن فخذوھا والا فدعوھا[19]	عنقریب مجھ سے حدیث روایت کرنے والے راوی ہوں گے۔ لہٰذا تم حدیث کو قرآن پر پیش کرو، اگر قرآن اس کی موافقت کرے تو اسے قبول کرلو ورنہ

چھوڑ دو۔

اس اعتبار سے بھی موجودہ دور میں حدیث شریف پر تحقیقی کام کرنا بہت ضروری ہے، تاکہ موجودہ دور کے فتنوں کا صحیح جواب ہوسکے اور خاص کر آج کل جو لوگ حدیث نبوی پر بے اعتباری ظاہر کرتے ہیں ان کا موثر طور پر رد ہوسکے۔

غرض موجودہ دور میں کسی راوی کی "ثقاہت" یا اس کا "ضعف" معلوم کرنے کا معیار بجائے "روایت" کے "درایت" ہونا چاہئے۔ یعنی حدیث پر علمی و عقلی نقطۂ نظر سے بحث کرکے دیکھنا چاہئے کہ اس کی صحت و صداقت کتاب اللہ میں موجود معانی و مضامین کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور یہ کام انتہائی دقت نظر اور بصیرت مبنی کا طالب ہے، مگر اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی قول یا عمل صادر ہوا ہے اور آپؐ نے جو بھی فیصلے کئے ہیں وہ حسب ذیل آیات کی رو سے قرآن ہی سے ماخوذ اور قرآن فہمی کے تابع ہیں:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (نحل: ۴۴)	اور ہم نے تیرے پاس (کتاب) تذکرہ بھیج دی ہے تاکہ تو لوگوں کے لئے ان باتوں کی وضاحت کرسکے جو ان کے پاس بھیجی گئی ہیں اور وہ (ان باتوں میں) غور کرسکیں۔
اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ (نساء: ۱۰۵)	ہم نے تیرے پاس یہ کتاب حقانیت کے ساتھ بھیج دی ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اللہ کی فہمائش کے مطابق فیصلہ کرسکے۔

چنانچہ اس موقع پر کلام الٰہی میں " بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ " کے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ حد درجہ بلیغ اور قابل غور وحجت ہیں اور اس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے "ارادتِ الٰہی" یا "اللہ کی نمایش" کے مطابق ہوا کرتے تھے جو فہم قرآن ہی کے تابع تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) کا قول ہے کہ امت (فقہی مسائل میں) جو کچھ بھی کہتی ہے وہ حدیث کی شرح ہے اور حدیث جو کچھ کہتی ہے وہ قرآن کی شرح ہے۔ جمیع ما تقولہ الامۃ شرح للسنۃ، وجمیع السنۃ شرح للقرآن

اور اس سلسلے میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

انی لا احل الا ما احل اللہ فی کتابہ ولا احرم الا ما حرم اللہ فی کتابہ	میں اپنی طرف سے کوئی چیز حلال نہیں کرتا سوائے اس کے جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور میں اپنی طرف سے کوئی چیز حرام نہیں کرتا سوائے اس کے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے۔

اس اعتبار سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں ایک ہی سرچشمہ سے ثابت شدہ ہیں۔ زبانِ نبوت سے جو بھی بات نکلی ہے وہ کتاب اللہ ہی کی شرح وتفسیر ہے چاہے وہ فقہی مسائل سے متعلق ہو یا غیر فقہی امور سے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد باری ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (نجم: ۳-۴)	وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، یہ تو وحی ہے جو اس پر آتی ہے۔

قدیم مفسرین کے انکشافات

بہرحال آئیے دیکھیں کہ سورج کی موت کے بارے میں

قدیم مفسرین کیا کہتے ہیں؟ چنانچہ دنیائے اسلام کی سب سے قدیم تفسیر ابن جریر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) کی جامع البیان فی تفسیر القرآن قرار دی جاتی ہے اور اس میں سورج کی "تکویر" یعنی اس کی بساط لپیٹے جانے کے سلسلے میں حسب ذیل حقایق ملتے ہیں جو صحابہ وتابعین اور تبع تابعین سے منقول ہیں:

۱۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ سے مقصود یہ ہے کہ وہ تاریک ہوجائے گا۔ (كُوِّرَتْ : ذَهَبَتْ)

۲۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسرا قول یہ بھی مروی ہے کہ سورج نابید ہوجائے گا۔ (كُوِّرَتْ : ذَهَبَتْ)

۳۔ مجاہدؒ سے مروی ہے کہ وہ مضمحل ہوکر ختم ہوجائے گا۔ (اضمحلت وذهبت)

۴۔ قتادہؒ سے مروی ہے کہ اس کی روشنی ختم ہوجائے گی۔ (ذَهَبَ ضَوْءُهَا)

۵۔ سعیدؒ سے مروی ہے کہ سورج اندھا ہوجائے گا۔ (غُوِّرَتْ : وهی بالفارسیة كُوْرْ تَكُوْر)

۶۔ ضحاک سے مروی ہے کہ اس سے مراد سورج کا خاتمہ ہے (ذَهَابُهَا)

۷۔ ابوصالح سے مروی ہے کہ سورج الٹا دیا جائے گا۔ (نُكِسَتْ)

۸۔ ابوصالح ہی سے مروی ہے کہ سورج نیچے ڈال دیا جائے گا۔ (اُلْقِيَتْ)

۹۔ ربیع بن خثیم سے مروی ہے کہ سورج پھینک دیا جائے گا۔ (رُمِيَ بِهَا)

اس کے بعد علامہ ابن جریرؒ تحریر کرتے ہیں کہ کلام عرب میں تکویر کے معنی کسی چیز کے ایک حصے کو اس کے دوسرے حصے سے ملانے کے ہیں، جیسے پگڑی لپیٹنا جو سر پر باندھی جاتی ہے۔ یا جیسے کپڑوں کی گٹھری باندھی جاتی ہے۔ اسی طرح سورج کو لپیٹنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعض حصے کو بعض سے

ملا کر لپیٹا جائے اور اسے پھینک دیا جائے اور جب یہ واقعہ ہوگا تو اس کی روشنی زائل ہو جائے گی۔

لہذا اس تاویل کی رو سے مذکورہ بالا دونوں قسم کے اقوال (سورج کی روشنی کا زائل ہونا اور اسے پھینک دیا جانا) صحیح ہیں۔ نتیجہ یہ کہ جب سورج کو لپیٹ کر پھینک دیا جائے گا تو اس کی روشنی زائل ہو جائے گی۔

والتکویر فی کلام العرب جمع بعض الشئ الی بعض وذلک کتکویر العمامۃ وھو لفھا علی الراس وکتکویر الکارۃ وھی جمع الثیاب بعضھا الی بعض ولفھا وکذلک قولہ اذا الشمس کورت انما معناہ جمع بعضھا الی بعض ثم لفت ورمی بھا واذا فعل ذلک بھا ذھب ضوءھا فعلی التاویل الذی تاولناہ وبیناہ لکلا القولین الذین ذکرت عن اھل التاویل وجہ صحیح وذلک انھا اذا کورت ورمی بھا ذھب ضوءھا [۲۲]

واضح رہے سورج کی تکویر یا اس کی بساط لپیٹ دینا بطور "استعارہ" ہے جو بلاغت کی ایک قسم ہے اور اس اعتبار سے یہ انتہائی درجہ معنی خیز حقیقت ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ علامہ موصوف نے جدید سائنسی تحقیقات سے ناواقفیت کے باوجود اس کی صحیح صحیح تاویل کس طرح کر دی جو عین مطابق واقعہ ہے! اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے لے کر ربیع بن خثیم تک تمام قدیم مفسرین کا تال اور سر شترک کس طرح بن گیا؟ الفاظ اگرچہ مختلف ہیں مگر نتیجہ سب کا ایک ہی ہے۔ لہذا اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہوں نے یہ سب باتیں اپنے دل سے گھڑ کر پیش کی ہیں؟ ظاہر ہے کہ اگر بات ایسی ہوتی تو ان سب اقوال میں معنوی اتحاد ہرگز نہ پایا جاتا۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ یہ سب باتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سُن کر بیان کی گئی ہوں گی۔ کیونکہ ایک ہی حقیقت کو مختلف اسالیب میں بیان کیا گیا ہے جن میں کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے۔ لہذا قرآن اور حدیث کے ساتھ ساتھ مفسرین اور راویانِ حدیث کی

یہ مطابقت بھی اسلام کا ایک زبردست اعجاز نہیں تو پھر کیا ہے؟

راویانِ حدیث کی صداقت

واقعہ یہ ہے کہ یہ بات صرف ابن جریر طبریؒ ہی تک محدود نہیں بلکہ اس سلسلے میں حدیث اور تفسیر کی تمام کتابوں میں "تکویر" اور "انفطار" وغیرہ کے تعلق سے یہی تمام حقائق مذکور ہیں جو علمی حلقوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے بہت کافی ہیں اور ان حقائق و معارف کے ملاحظے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین میں تکوینیات یا سائنسی علوم کی کس قدر اہمیت ہے، جنھیں آج خود مسلمان نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ وہ علوم و حقائق ہیں جن کے ذریعہ آج ساری دنیا کو اٹھایا اور بٹھایا جا سکتا ہے اور ان کی بنیاد پر ایک ایسا فکری انقلاب لایا جا سکتا ہے جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار ہوگا اور احیائے علم اور احیائے دین کا باعث بنے گا۔ آج دین کی تجدید علم کی تجدید ہی پر موقوف ہے۔ کیونکہ موجودہ دور میں "علم" کو جو اہمیت حاصل ہو گئی ہے وہ سابقہ کسی بھی دور میں نہیں تھی۔

آئیے اس سلسلے میں سب سے پہلے دنیائے اسلام کی سب سے زیادہ مستند ترین کتاب (کتاب اللہ کے بعد) "بخاری" سے اپنے مطالعہ کا آغاز کریں۔ امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) نے کتاب "بدء الخلق" (ابتدائے تخلیق) میں جہاں پر چاند اور سورج کی بعض صفات و خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے وہاں پر حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تکویر سے مراد سورج کی بے نوری ہے:

وقال الحسن: کُوِّرَتْ تکوّر حتی یذھب ضوءھا [۲۳]

نیز علامہ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) نے "تفسیر القرآن العظیم" میں اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) نے تفسیر درِ منثور میں "تکویر" اور "انکدار" کی تفسیر میں تقریباً وہی تمام معانی پیش کئے ہیں جو تفسیر ابن جریر میں مذکور ہیں۔ مثلاً: (۱) اُظْلِمَتْ: تاریک ہو جائے گا (۲) غُوِّرَت یا اُغْوِرَت: دھنسا دیا جائے گا (۳) رمی بھا: پھینک دیا جائے گا (۴) نُکِّسَت: پھیر دیا

ہو جائے گا (۵) اِضمحلت: کمزور ہو جائے گا (۶) ذَھَبَ ضَوْءُھَا: اس کی روشنی زائل ہو جائے گی (۷) وہ اندھا ہو جائے گا۔

اور "وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ" کی تفسیر میں مختلف روایات کے تحت حسب ذیل اقوال منقول ہیں: (۱) تغیّرت: ستارے بدل جائیں گے (۲) تناثرت: منتشر ہو جائیں گے (۳) تساقطت: جھڑ پڑیں گے (۴) تساقطت وتھافتت: لڑھک جائیں گے[۲۴]

انہی تمام روایات کی بنا پر پورے ذخیرۂ تفسیر میں یہی سب اقوال گردش کر رہے ہیں جو بالکل صحیح ہیں اور امام رازیؒ (م ۶۰۶ھ) نے لغوی اعتبار سے اس کے حسب ذیل معنی بیان کئے ہیں: (۱) تکویر کی دو صورتیں ہیں: اول یہ کہ کسی چیز کو گولائی کے طور پر لپیٹنا جس طرح کہ عمامہ لپیٹا جاتا ہے اور اس اعتبار سے لفظ طَیّ، لفّ، کور اور تکویر سب ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے دھوبی کی گٹھڑی کو "کارۃ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام کپڑوں کو ایک کپڑے میں باندھ لیتا ہے (۲) دوم یہ کہ اس سے مراد گرا دینا یا ڈھا دینا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کورت الحائط ودھورتہ: یعنی میں نے دیوار کو دھکا دے کر گرا دیا۔ تو اس صورت میں اذا الشمس کورت کا مطلب ہوگا کہ سورج کو آسمان سے گرا دیا جائے گا (القیت و رمیت عن الفلک) نیز اس کے علاوہ ایک تیسرا قول بھی حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ یہ لفظ فارسی زبان سے ماخوذ ہے جس کے معنی "گور" یعنی اندھے کے ہیں[۲۵]

اسی بنا پر اہل لغت نے بھی یہی تمام معنی بیان کئے ہیں جو دور اول ہی سے مشہور و مقبول رہے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ لغت کی تمام بڑی کتابوں میں یہی معانی و مطالب منقول ہیں اور ان تمام کی مثالیں دینا اس موقع پر طوالت کا باعث ہوگا[۲۶]

سورج اور چاند کا خاتمہ یہ تھی سورج کی "طبعی موت" کی داستان جو عبرتوں

اور بصیرتوں سے پُر ہے۔ اب ملاحظہ فرمایئے سورج کے ساتھ ساتھ چاند کی موت اور ان دونوں اجرام یعنی آفتاب و ماہتاب کی مشترکہ داستان اور ان دونوں کا انجام۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن آفتاب و ماہتاب دونوں کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ (الشمس والقمر مکوران یوم القیامۃ)[۲۷] بعض دیگر روایات میں مذکور ہے کہ چاند اور سورج کو پیر کٹے ہوئے بیلوں کی طرح "معذور" بنا کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ الشمس والقمر ثوران عقیران فی النار[۲۸]

ایک اور حدیث کچھ اضافے کے ساتھ اس طرح آئی ہے کہ چاند اور سورج کو پیر کٹے ہوئے بیلوں کی طرح دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر اگر اللہ نے چاہا تو ان دونوں کو باہر نکالے گا ورنہ اسی میں رہنے دے گا۔ الشمس والقمر عقیران فی النار ان شاء اخرجھما وان شاء ترکھما[۲۹] اس حدیث کو علامہ عبدالرؤف مناوی نے ضعیف قرار دیا ہے[۳۰]

ان احادیث میں لفظ "عقیران" عقیر کا تثنیہ ہے، جو "عقر" سے ماخوذ ہے اور اس کے اصل معنی اونٹ یا بکری کے پیر تلوار سے کاٹ دینے کے ہیں[۳۱]

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چاند اور سورج کو "پیر کٹے ہوئے بیلوں" سے کیوں تشبیہ دی گئی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ان کی "دوڑ" (جری) یا "تیراکی" (سباحت)[۳۲] روک دی جائے گی تو گویا کہ وہ "بے دست و پا" یا "معذور" بن کر رہ جائیں گے[۳۳] ان کی دوڑ روکنے سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی "قوت کشش" (گراویٹیشن) ختم کر دی جائے جس کی وجہ سے وہ دوڑنے یا تیرنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ تب انہیں جہنم میں ڈھکیل دیا جائے گا۔

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر چاند سورج کا قصور کیا ہے کہ انہیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا؟ یہ سوال امام حسن بصریؒ کا ہے جس کا جواب امام خطابیؒ نے اس طرح

دیا ہے کہ: اس سے مقصود چاند اور سورج کو عذاب دینا نہیں بلکہ یہ بات چاند سورج کی عبادت کرنے والوں کی سرزنش کی غرض سے ہے تاکہ وہ جان لیں کہ ان اجرام کی عبادت کرنا ایک باطل حرکت تھی[۳۴] حافظ ابن حجرؒ نے عطاء بن یسارؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ارشاد باری: وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (سورۂ قیامہ: ۹) اور آفتاب و ماہتاب کو اکٹھا کر دیا جائے گا، سے مراد یہ ہے کہ ان دونوں کو یکجا کرکے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا[۳۵] (باقی)

حواشی

۱ المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، مطبوعہ بیروت ۲ معجم الفاظ القرآن الکریم ۱/۶۲۲، الہیئۃ المصریۃ، ۱۹۷۰ء ۳ دیکھئے آکسفورڈ السٹریٹڈ انسائیکلوپیڈیا، ۸/۵۴، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نیویارک، ۱۹۹۳ء ۴ Helium ۵ اسی بنا پر قرآن حکیم میں سورج کو چراغ (سراج) سے تشبیہ دی گئی ہے ۶ White Dwarf ۷ The Birth and Death
Gamow, George, The Birth and the Death of the ۸ of the Sun.
Sun, The New American Liberary, New York, 1956, P. 140
۹ یعنی جس طرح ایک شعلہ بجھنے سے پہلے بھڑک اٹھتا ہے، اسی طرح سورج بھی ٹھنڈا ہونے سے پہلے پھیل کر ایک دیو ہیکل "سرخ شعلے" کی صورت اختیار کر لے گا ۱۰ Encyclopaedia
۱۲ Nova واحد، Nove ۱۱ Britannica, 1983, Vol. 17, P 808.
Oxford Illustrated Encyclopaedia, Vol 8, The Universe, P. 110.
Gamow, George, The Birth and the Death of ۱۳ New York. 1993.
the Sun, P. 159 ۱۴ Milky Way ۱۵ Big Bang Theory ۱۶ جامع ترمذی کتاب تفسیر القرآن ۵/۳۳۳ مطبوعہ بیروت، مستدرک حاکم ۴/۵۷۶، مطبوعہ بیروت، نیز بقول

امام سیوطی اس حدیث کو امام احمد اور ابن منذر نے بھی روایت کیا ہے، دیکھئے تفسیر در منثور ۸/۳۲۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۹۹۳ء ۱۷ دیکھئے مستدرک حاکم ۴/۵۷۶-۵۷۷، مطبوعہ بیروت ۱۸ طبرانی منقول از کنز العمال: ۱/۱۷۹، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۹ء ۱۹ ابن عساکر، منقول از کنز العمال: ۱/۱۹۷ ۲۰ الاتقان فی علوم القرآن، از جلال الدین سیوطی ۲/۱۶۰، مصر، ۱۹۷۸ء ۲۱ ایضاً، نیز ملاحظہ ہو کنز العمال ۱/۱۹۵، موسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۹۸۹ء ۲۲ جامع البیان فی تفسیر القرآن (تفسیر ابن جریر) طبری، ۳۰/۱۴۳، دار المعرفۃ بیروت، ۱۹۸۰ء ۲۳ صحیح بخاری، باب صفۃ الشمس والقمر، ۴/۷۵، مطبوعہ استانبول، ۱۹۸۱ء ۲۴ تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر) ۳/۷۵۴، مطبوعہ قاہرہ، تفسیر الدر المنثور ۸/۴۲۶- دار الفکر بیروت، ۱۹۹۳ء ۲۵ تفسیر کبیر: ۳۱/۶۷، دار الفکر بیروت، ۱۹۹۴ء نیز ملاحظہ ہو، تفسیر کشاف ۴/۲۲۱، مطبوعہ تہران، تفسیر بیضاوی ۵/۴۵۶، بیروت، ۱۹۹۶ء-
۲۶ دیکھئے لسان العرب ۵/۱۵۶، دار صادر بیروت، تاج العروس من جواہر القاموس، ۷/۳۶۱، طبع جدید دار الفکر بیروت ۱۹۹۴ء ۲۷ صحیح بخاری، ۴/۷۵، ۲۸ مسند ابوداؤد طیالسی ص ۲۸۱ دار المعرفۃ بیروت، نیز دیکھئے جامع الاحادیث، علامہ جلال الدین سیوطی ۲/۲۳۷، دار الفکر بیروت ۱۴۱۴ھ ۲۹ ابن مردویہ، منقول از کنز العمال، ۶/۱۵۳، مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ، بیروت
۳۰ فیض القدیر شرح جامع صغیر ۴/۱۷۷، المکتبۃ التجاریۃ مکۃ المکرمۃ ۳۱ ملاحظہ ہو: النہایۃ فی غریب الحدیث، ابن اثیر، ۳/۲۷۱، المکتبۃ الاسلامیۃ ۳۲ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: کل یجری لاجل مسمی، ہر ایک مقررہ وقت تک دوڑتا رہے گا اور دوسری جگہ ارشاد ہے: کل فی فلک یسبحون، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے (انبیاء: ۳۳) ۳۳ دیکھئے النہایۃ فی غریب الحدیث ۳/۲۷۵ ۳۴ دیکھئے فتح الباری، حافظ ابن حجر ۶/۳۰۰، مطبوعہ دار الافتاء ریاض ۳۵ ایضاً۔

علمائے اصول اور خبر مطعون کی اقسام

از ڈاکٹر محمد باقر خاں خاکوانی٭

(۲)

محدثین کے اعتراضات کے کئی اقسام ہیں، جن میں بعض کو علمائے اصول نے قبول کیا ہے اور بعض کو قبول نہیں کیا۔ اس کی تفصیل بصورت جدول ملاحظہ ہو۔

٭ لیکچرر ادارہ علوم اسلامیہ و عربیہ جامعہ بہاء الدین زکریا۔ ملتان

۳۔ تلبیس کا اعتراض — کی وجہ سے ہو۔ — کی وجہ سے ہو۔

۴۔ بد اخلاق ہونے کا اعتراض — اس کی بے شمار اقسام ہیں۔ — جیسے معتزلہ، خوارج

۵۔ گھوڑ سواری کرنے کا اعتراض — قدریہ وغیرہ اہل سنت پر

۶۔ اکثر مذاق کرنے کا اعتراض — لگاتے ہیں۔

۷۔ کم عمری کا اعتراض — نبیذ پینے کی وجہ سے فاسق سمجھنا۔

۸۔ روایات کم کرنے کا اعتراض — ذبیحہ پر عمداً بسم اللہ نہ پڑھنے سے فاسق سمجھنا۔

۹۔ فروعی فقہی مسائل زیادہ بیان کرنے کا اعتراض — یعنی ایسے مسائل جس میں ایک نقطۂ نظر کے اجتہاد کا دوسرے نقطۂ نظر سے اتفاق نہ ہو۔

حدیث پر صحابہ کرام کے اعتراض کی مختلف صورتیں ہیں۔

(الف) حدیث کے مخفی رہنے کا احتمال نہ ہو اور پھر مخالفت کی گئی ہو: اگر صحابۂ کرام ایسی حدیث کی مخالفت کرتے ہیں جس کے مخفی رہنے کا احتمال نہیں ہوسکتا، تو یہ احناف کے نزدیک ان کی طرف سے حدیث پر اعتراض ہے جو حدیث کو مطعون اور ناقابل حجت بنادے گا۔

مثلاً حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے:

البکر بالبکر جلد مائة وتغریب عام (۱) — اگر کنوارا کنواری سے زنا کرے تو اسے سو کوڑے اور جلاوطنی کی سزا دو۔

جلاوطنی سے مراد شہر بدر کرنا ہے یعنی اسے اس کے مسکن سے اتنا دور بھیج دیا جائے جہاں تک کے سفر سے نماز قصر ہوجاتی ہے[۲] لیکن حضرت عمرؓ نے جب ربیعہ بن خلف کو خیبر کی طرف جلاوطن کیا

(۱) سنن ابی داؤد۔ کتاب ابواب الحدود، باب حد الزنا، حدیث نمبر ۲۵۰۸، (۲) عبدالعزیز بخاری۔ کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، ج ۳ ص ۸۶، نیز ملاحظہ فرمائیں، امیر بادشاہ۔ تیسیر التحریر ج ۳، ص ۴۷۔

اور وہ ہرقل روم سے مل گیا اور عیسائی ہوگیا۔ تو آپؓ نے فرمایا "میں اب کسی کو جلاوطن نہیں کروں گا۔ ایسے ہی حضرت علیؓ نے بھی فرمایا کہ "جلاوطنی ایک فتنہ ہے"[1] ان دونوں خلفائے راشدین سے یہ حدیث مخفی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ امام کے فرائض میں سے ایک فریضہ حد کا قائم کرنا بھی ہے اور حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ تو ان شخصیات میں سے ہیں جن سے ہم دین سیکھتے ہیں اگر یہ ائمۂ صحابہ کسی حدیث کو جانتے ہوئے اس پر عمل ترک کر دیں اور اسے فتنہ قرار دیں تو یہ بات اس حدیث کے منسوخ ہونے پر دلیل ہے[2]

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شہر کو فتح کرتے تو غیر مسلموں پر جزیہ لگاتے اور وہ زمین اور دوسرا مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم فرما دیتے مثلاً نضیر، قریظہ اور خیبر کی فتح کے موقع پر آپؐ نے ایسا کیا لیکن حضرت عمرؓ نے جب عراق کو فتح کیا تو بقیہ مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کرکے زمین اہلِ عراق کے پاس رہنے دی اور ان سے اس کا خراج وصول کیا۔ تو یہ ممکن نہیں کہ حضرت عمرؓ کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم نہیں تھا، بلکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ بات حتمی نہیں اور مزید یہ کہ اس سوادِ عراق کے مسئلہ پر شوریٰ کے اندر کئی دن بحث ہوتی رہی اور حضرت عمرؓ کی اس رائے کی مخالفت صرف حضرت بلالؓ نے اور کچھ اور صحابہ نے کی جن کا نفقہ معروف نہیں تھا اور باقی تمام صحابہ نے آپؓ کے اس موقف کی حمایت کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حتمی حکم نہ تھا جس کو حضرت عمرؓ نے بدل دیا[3]۔

ایسے ہی حضرت عمرؓ نے متعۃ النساء اور متعۃ الحج سے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ عہدِ نبوی

---

[1] فخر الاسلام بزدوی، اصول البزدوی، ص ۱۹۶ [2] ملا جیون۔ نور الانوار شرح المنار، ج ۲ ص ۸۰ نیز ملاحظہ فرمائیں، امیر بادشاہ۔ تیسیر التحریر، ج ۳ ص ۷۴، حسام الدین۔ الحسامی مع النامی، ج ۱، ص ۳۵ [3] نسفی۔ کشف الاسرار شرح المنار، ج ۲ ص ۲۸ نیز ملاحظہ فرمائیں۔ سرخسی۔ اصول السرخسی، ج ۲ ص ۹۔

صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا مگر میں ان سے روک رہا ہوں۔ اس لئے ابن سیرین نے کہا کہ حضرت عمرؓ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عورتوں سے متعہ کرنے کے حکم کے مروج ہونے کی شہادت بھی دیتے اور اس سے روکتے بھی تھے۔[1]

(ب) حدیث کے مخفی رہنے کا احتمال کے ساتھ صحابہ مخالفت کریں: اگر حدیث کے مخفی رہنے کا احتمال ہو تو صحابۂ کرام کا اس کے خلاف عمل اس حدیث کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگا کیونکہ امکان ہے کہ وہ حدیث صحابی تک نہ پہنچی ہو اور وہ کسی اور حدیث یا اپنے اجتہاد پر عمل کرتے رہے ہوں مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ کو طواف الصدر کی رخصت عطا فرمائی تھی[2] یعنی اگر حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد صرف طواف الصدر باقی رہ جائے اور عورت کو حیض شروع ہو جائے تو وہ یہ طواف چھوڑ کر گھر آ سکتی ہے۔ مگر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس پر عمل نہیں کرتے تھے اور اگر اپنی خواتین کے ساتھ حج پر جاتے اور یہ صورتِ حال رونما ہوتی تو پاک ہونے کے بعد خواتین کو طواف صدر کروا کے واپس لاتے۔ لہٰذا یہ ممکن ہے ان تک رخصت والی حدیث نادر الوقوع ہونے کی وجہ سے نہ پہنچی ہو۔ اس لئے وہ اس حدیث پر عمل نہ کرتے ہوں[3]

ایسے ہی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس حدیث پر عمل نہیں کرتے تھے جس میں حکم ہے کہ نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو اور نماز دونوں فاسد ہو جاتے ہیں[4] ممکن ہے کہ ان کا اس حدیث کے خلاف عمل عدمِ واقفیت کی وجہ سے ہو، کیونکہ یہ

---

[1] فخر الاسلام بزدوی۔ اصول البزدوی، ص ۹۶ [2] صحیح بخاری۔ کتاب الحیض، باب المرأۃ تحیض بعد الافاضۃ حدیث نمبر ۳۱۳ [3] سرخسی۔ اصول السرخسی، ج ۲ ص ۳ نیز ملاحظہ فرمائیں، مولوی شریف۔ شرح التوضیح ج ۲ ص ۱۴۴ [4] سنن دار قطنی۔ کتاب الطہارۃ، باب احادیث القہقہۃ فی الصلاۃ وعللہا۔

حدیث نادر واقعات سے متعلق ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حدیث ان تک نہ پہنچی ہو۔[1]

جمہور کے نزدیک صحابی کے حدیث کی مخالفت کرنے کی صورت میں حدیث مطعون نہیں ہوگی اور حدیث پر عمل کیا جائے گا اور صحابی کے عمل کو اس کی رائے یا اجتہاد پر محمول کیا جائے گا۔[2]

۲۔ محدثین کے اعتراضات محدثین اگر حدیث کے راوی پر اعتراض کریں تو ان کا اعتراض بھی حدیث کو مطعون بنا دیتا ہے لیکن ان کے اعتراضات کے کئی اقسام ہیں اور پھر ان تمام اقسام کی تحقیق کی جائے گی کہ آیا یہ اعتراض علمائے اصول کے نزدیک بھی معتبر ہیں یا وہ ان کو غیر معتبر گردانتے ہیں۔ اگر وہ اعتراض معتبر ہوئے تو حدیث کی حجت پر اثر پڑے گا اور اگر معتبر نہ ہوئے تو حدیث قابل حجت ہوگی اور اعتراض رد کر دئے جائیں گے۔[3]

اگر محدثین کسی راوی پر مبہم اعتراض کرتے ہیں، مثلاً ان کا یہ اعتراض کہ وہ حدیث منکر ہے ثابت نہیں، فلاں متروک الحدیث ہے، ذاہب الحدیث ہے، مجروح ہے یا فلاں عادل نہیں اور انہوں نے اس کا سبب نہیں بتایا کہ کس وجہ سے اس پر یہ اعتراضات وارد ہوئے ہیں تو ان کے اعتراضات جمہور کے نزدیک رد کر دئے جائیں گے لیکن ابوبکر الباقلانی اور کچھ علماء کے نزدیک مبہم اعتراض بھی قبول کیا جائے گا۔[4]

---

[1] عبدالعزیز بخاری۔ کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، ج ۳ ص ۸۰، نیز ملاحظہ فرمائیں، امیر بادشاہ۔ تیسیر التحریر، ج ۳ ص ۴۷۔ [2] ملا جیون۔ نور الانوار، ج ۲ ص ۸۱ [3] ماوردی۔ ادب القاضی ج ۱ ص ۳۹۶ امیر بادشاہ۔ تیسیر التحریر، ج ۳ ص ۷۳۔ شریف تلمسانی۔ مفتاح الوصول فی علم الاصول، ص ۸۲ [4] سرخسی اصول السرخسی، ج ۲ ص ۹ [5] عبدالعزیز بخاری۔ کشف الاسرار شرح المنار، ج ۳ ص ۸۰، نیز ملاحظہ فرمائیں۔ تفتازانی۔ التلویح شرح التوضیح، ج ۲ ص ۱۳۱۔

جمہور کی رائے میں مسلمانوں کی ظاہری عدالت خیر القرون میں خصوصاً اور باقی ادوار میں عموماً ایک مسلم امر ہے۔ اس لئے ظاہر عدالت کو مبہم اعتراض کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ شہادت کا معاملہ روایت حدیث سے زیادہ نازک ہے کیونکہ اس میں عدد اور حریت کی شرط ہے۔ جب اس میں مبہم اعتراض پر گواہی رد نہیں کی جاسکتی تو حدیث میں بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہئے۔ اس لئے محدثین کے مبہم اعتراض کی وجہ سے کسی راوی کی حدیث مطعون تصور نہیں ہوگی۔[1]

اگر محدثین کی طرف سے اعتراض کی وضاحت کی گئی ہے تو اس بات کا امکان ہے کہ بعض کے نزدیک وہ اعتراض معتبر نہ ہو اور کچھ کے نزدیک معتبر ہو اور اگر وہ اعتراض معتبر ہو اور راوی کی صحت پر اثر انداز ہو تو اس کی بھی دو اقسام ہیں۔ ایک قسم میں اجتہادی اختلاف کی وجہ سے اعتراض ہوتا ہے اور دوسری قسم میں متفق علیہ اعتراض ہوتا ہے۔ اجتہادی اختلاف کی مثال یہ ہے جیسے جمہور کے نزدیک نبیذ پینے والا فاسق ہے لیکن احناف کے نزدیک نبیذ حلال ہے۔ ایسے ہی احناف کے نزدیک ذبیحہ پر عمداً بسم اللہ نہ پڑھنے سے ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے مگر شوافع کے نزدیک نہیں ہوتا۔ دوسری قسم میں اعتراضات متفق علیہ ہوتے ہیں جن کے دو اقسام ہیں۔ یا تو وہ اعتراضات نصیحت اور اصلاح کے لئے لگائے جائیں جیسے عام محدثین یا علمائے اصول لگاتے ہیں یا پھر وہ تعصب اور عداوت کی وجہ سے لگائے جائیں جیسے معتزلہ، خوارج، قدریہ، جبریہ، امامیہ اور دوسرے فرقوں والے اہل سنت پر لگا کر ان کی روایات قبول نہیں کرتے۔[2]

---

[1] نسفی۔ کشف الاسرار شرح المنار، ج ۲ ص ۴۴، نیز ملاحظہ فرمائیں، صدر الشریعہ۔ التوضیح مع التلویح، ج ۲ ص ۱۴۴ [2] حسام الدین۔ حسامی مع النامی، ج ۱ ص ۴۵۔ شیرازی۔ کتاب اللمع ص ۴۸ (حاشیہ صفحہ ۳۴۹)

(الف) غیر معتبر اعتراض: ایسے اعتراضات جو معتبر نہیں وہ احناف کے نزدیک نو ہیں۔

۱۔ فقہاء اور علمائے اصول پر حدیث سے ناواقفیت کا اعتراض کرنا ۲۔ تدلیس و ارسال کا اعتراض ۳۔ تلبیس کا اعتراض ۴۔ بداخلاقی کا اعتراض ۵۔ گھوڑ سواری کا اعتراض ۶۔ کثرت مذاق کا اعتراض ۷۔ کم عمری کا اعتراض ۸۔ روایات کم بیان کرنے کا اعتراض ۹۔ فروعی فقہی مسائل زیادہ بیان کرنے کا اعتراض [1]

۱۔ فقہاء اور علمائے اصول پر حدیث سے ناواقفیت کا اعتراض: ائمۂ کرام مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ وغیرہم پر اس قسم کا اعتراض کہ وہ علم حدیث سے یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے آشنا نہ تھے یا انہیں چند حدیثیں یاد تھیں وغیرہ بالکل بے بنیاد اور تعصب کی وجہ سے ہیں جیسے بعض متعصبین حضرت امام ابوحنیفہؒ پر عدم واقفیت حدیث کا الزام لگاتے ہیں اور دلیل دیتے ہیں کہ ان کا بیٹا ان کے استاد حماد کی کتاب سے ان کی لکھی ہوئی حدیثیں بیان کر رہا تھا کہ امام صاحب نے اس سے کتاب چھین لی اور اس سے خفا ہوئے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ امام صاحبؒ کے تقویٰ کی دلیل ہے کیونکہ وہ حدیث کو حافظ کی مدد سے بیان کرنے کو اولیٰ سمجھتے تھے اور یہ بات حقیقت ہے کہ حافظ پر انحصار کرنے والا غلطیاں کم کرتا ہے [2]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۱) [3] سرخسی۔ اصول السرخسی، ج ۲ ص ۹-۱۱ نیز ملاحظ فرمائیں ملاجیون۔ نور الانوار ج ۲ ص ۸۲-۸۳۔ عبدالحق حقانی۔ النامی شرح الحسامی، ج ۱ ص ۱۵۴ (حاشیہ ص ہذا) [1] فخر الاسلام بزدوی اصول البزدوی، ص ۱۹۷-۲۰۰ [2] سرخسی۔ اصول السرخسی ج ۲ ص ۹ نیز ملاحظ فرمائیں، عبدالعزیز بخاری کشف الاسرار، شرح اصول البزدوی، ج ۳ ص ۷۸۹۔

۳، ۲۔ تدلیس ارسال و تلبیس کا اعتراض: تدلیس کے لغوی معنی مشتری سے مال کو عیب کو چھپانا ہے لیکن محدثین کی اصطلاح میں اس سے مراد حدیث کی سند کو چھپانا اور اس طرح کہنا "حدثنا فلان عن فلان" اور ایسے نہ کہنا کہ میں نے فلاں "اس کا نام لے کر" سے سنا اور پھر پوری سند بیان کرے۔ محدثین کے نزدیک تدلیس کی دو قسمیں ہیں۔ تدلیس الاسناد اور تدلیس الشیوخ اور وہ حدیث مدلس کو ناقابل حجت سمجھتے ہیں [1]

لیکن جمہور علمائے اصول کے نزدیک تدلیس میں ارسال کی طرح شبہ ہے کہ مبادا اس نے درمیان میں کوئی راوی چھوڑ دیا ہو اور جس طرح ارسال راوی میں طعن کا باعث نہیں بنتا اس طرح جمہور کے نزدیک تدلیس بھی حدیث کو مطعون نہیں بناتی [2]

لیکن بعض شافعیہ کے نزدیک حدیث مدلس میں توقف کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ راوی متن حدیث میں تو تدلیس نہیں کرتا؛ جو محدثین کے نزدیک مدرج کہلاتی ہے۔ اگر وہ متن میں تدلیس کرتا ہے تو اس کی حدیث شافعیہ اور حنبلیہ دونوں کے نزدیک مطعون اور قابل رد ہوگی [3] اور اگر وہ سند میں تدلیس کرتا ہو تو دیکھا جائے گا کہ کیا وہ سند کے ناموں کو بالکل بدل دیتا ہے یا صرف اپنے سے اوپر والے راوی کو چھوڑ دیتا ہے۔ اول الذکر صورت میں وہ جھوٹا شمار ہوگا اور اس کی حدیث مطعون تصور ہوگی اور اگر ثانی الذکر صورت ہے تو اس قسم کی

---

[1] عبدالعزیز بخاری۔ کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، ج ۳ ص ۹۰، نیز ملاحظ فرمائیں ابن نجار فتوحی۔ شرح الکوکب المنیر، ج ۲ ص ۱۴۳ [2] عضد الدین ایجی۔ شرح مختصر المنتہی، ج ۲ ص ۷۰، نیز ملاحظ فرمائیں، نسفی۔ کشف الاسرار شرح المنار، ج ۲ ص ۴۸۔ بدخشی۔ شرح البدخشی، ج ۲ ص ۶۳۳، ابن نجار فتوحی۔ شرح الکوکب المنیر تحقیق وہبہ الزحیلی وغیرہ۔ مکہ مکرمہ۔ کلیۃ الشریعہ۔ الکتاب الخامس ج ۲ ص ۴۵۱ [3] ابن نجار فتوحی۔ شرح الکوکب المنیر ج ۲ ص ۴۴۱۔

تدلیس راوی کو مجروح نہیں کرے گی لیکن اس کی حدیث اگر وہ "روی عن فلان" کہتا ہے تو قبول نہیں کی جائے گی اور اگر وہ "حدثنی"، "اخبرنی" کہتا ہے تو حدیث قبول کی جائے گی[1]

ایسے ہی تلبیس سے مراد راوی کا اپنے استاد کا کسی ایسی کنیت کے ساتھ ذکر کرنا جو معروف نہ ہو، حتیٰ کہ محدثین کے لئے اس شخص کے حالات معلوم کرنا مشکل ہوں، اس کو محدثین تدلیس الشیوخ کہتے ہیں جیسے سفیان ثوری کا یہ کہنا کہ "حدثنی ابو سعید"۔ ابو سعید حضرت حسن بصری اور کلبی دونوں کی کنیت ہے، یہ بھی ارسال کی ایک قسم ہے اس لئے علمائے اصول کے نزدیک یہ اعتراض مناسب نہیں[2]

۴۔ بداخلاقی کا اعتراض: کسی پر بداخلاقی کا اعتراض حدیث کو مطعون نہیں بناتا، کیونکہ مختلف طبقوں کے نزدیک اخلاق کے مختلف معیار ہوتے ہیں۔ زاہد و پارسا لوگوں کا معیارِ اخلاق فقہاء و متکلمین کے معیارِ اخلاق سے نہیں ملتا اور نحویوں کا اخلاقی معیار مورخین کے معیار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے اعتراض سے حدیث کی حجیت ساقط نہیں ہوگی، مثلاً بعض لوگ واقعہ روایت کرتے ہیں کہ محمد بن الحسن الشیبانی نے عبداللہ بن مبارک سے کہا کہ وہ اپنی احادیث بیان کریں تاکہ امام محمد ان کو سنیں لیکن عبداللہ بن مبارک نے سنانے سے انکار کردیا۔ جب ان سے اس انکار کی بابت پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے ان کا اخلاق پسند نہیں آیا[3] حالانکہ یہ واقعہ ان کی طرف غلط منسوب کیا گیا ہے اور حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ عبداللہ بن مبارک نے کہا کہ اس امت میں ہر زمانہ میں ایک آدمی ایسا ہوگا جس کے

[1] ماوردی۔ ادب القاضی، ج ۱ ص ۱۰۴ نیز ملاحظہ فرمائیں، شیرازی۔ کتاب اللمع، ص ۷۷ [2] ملا جیون نور الانوار ج ۲ ص ۱۸، نیز ملاحظہ فرمائیں، ابن نجار فتوحی۔ شرح الکوکب المنیر، ج ۲ ص ۴۳۵ [3] سرخسی، اصول السرخسی، ج ۲ ص ۱۰۔

ذریعے اللہ تعالیٰ امت کے دین اور دنیا کی حفاظت فرمائیں گے اور جب ان سے پوچھا گیا کہ دورِ حاضر میں وہ کون ہے تو انہوں نے جواب دیا، محمد بن الحسن الکوفی[1]

۵۔ جانور دوڑانا: غیر معتبر اعتراضات میں سے ایک اعتراض راوی کا جانور دوڑانا یعنی گھوڑ دوڑ میں حصہ لینا اور گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنا وغیرہ ہے۔ حالانکہ گھوڑ دوڑ میں حصہ لینا شرعی حکم ہے تاکہ انسان جہاد کے لئے تیار رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور آپؐ نے اس کا حکم بھی فرمایا ہے۔ اس لئے محدثین کا یہ اعتراض بے معنی ہے جیسے شعبہ بن حجاج سے پوچھا گیا کہ آپؐ نے فلاں کی حدیث کیوں قبول نہیں کی تو انہوں نے جواب دیا: کیونکہ وہ گھوڑ دوڑ میں مشغول رہتا ہے۔[2]

۶۔ کثرتِ مزاح: ان اعتراضات میں سے ایک راوی کا اکثر مذاق کرتے رہنا ہے۔ حالانکہ اگر مذاق کرنے والا حق بات کرے، جھوٹ نہ بولے اور ہر شخص کی پگڑی اچھالنے کا عادی نہ ہو تو ایسا مذاق شرعاً مباح ہے جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی اونٹنی مانگنے آیا تو آپؐ نے فرمایا میں تو اونٹ کا بچہ دیتا ہوں۔ اس نے عرض کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بچہ کو کیا کروں گا، آپؐ نے فرمایا کہ بڑا اونٹ بھی تو کسی اونٹنی کا بچہ ہوگا۔[3]

اسی طرح آپ سے جب ایک بوڑھی نے عرض کی کہ میرے لئے جنت کی دعا کریں تو آپؐ نے فرمایا کہ جنت میں بوڑھیاں داخل نہیں ہوں گی۔ وہ بڑھیا رونے لگی، تو آپؐ نے فرمایا اس سے کہو کہ یہ جنت میں جوان ہو کر داخل ہوگی[4] اور آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

[1] نسفی۔ کشف الاسرار شرح المنار ج ۲ ص ۸۶ [2] عبدالعزیز بخاری۔ کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، ج ۳ ص ۹۴، نیز ملاحظہ فرمائیں عبدالحق حقانی۔ النامی شرح الحسامی ج ۱ ص ۱۵۴ [3] سنن ابی داؤد۔ کتاب الآداب، باب ما جاء فی المزاح، حدیث نمبر ۴۹۸۱ [4] ابن کثیر۔ اسماعیل بن کثیر القرشی۔ تفسیر القرآن العظیم قاہرہ، مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ ۱۹۵۶ء ج ۴ (تفسیر سورۃ الواقعہ)

إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنْشَاءً فَجَعَلْنَا	ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے
هُنَّ أَبْكَارًا [1]	سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں
	پاکیزہ بنا دیں گے۔

اس لئے یہ اعتراض بھی شرعی لحاظ سے مناسب نہیں [2]

۷۔ کم سنی: راویوں پر کم عمری کا اعتراض لگا کر ان کی روایات قبول نہ کرنے کا طریقہ بھی معتبر نہیں کیونکہ علمائے اصول اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ تحمل حدیث میں بلوغت اور عدالت شرط نہیں، اس لئے ان بے شمار صحابہؓ کے روایات کی قبولیت پر امت کا اجماع ہے جنھوں نے کم سنی میں احادیث سنیں اور بلوغت کے بعد بیان کیں اور اس اعتراض کی اجماع امت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں [3] اور علمائے اصول نے بعض مقامات پر صغار صحابی کی حدیث کو کبار صحابی کی حدیث پر بعض وجوہ کی بنا پر ترجیح دی ہے مثلاً عبد اللہ بن ثعلبہ کی صدقۂ فطر کے بارے میں اس حدیث کو علماء ابو سعید خدری کی حدیث پر فوقیت دیتے ہیں، عبد اللہ بن ثعلبہ کی حدیث یہ ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
علیہ وسلم ادوا عن کل حر و	ہر آزاد اور غلام کی طرف سے چاہے
عبد صغیر او کبیر نصف صاع	وہ بڑا ہو یا چھوٹا نصف صاع گندم
من بر او صاعا من تمر او صاعا	اور ایک صاع جو یا کھجور صدقۂ فطر کے

[1] الواقعہ- ۳۵ [2] نسفی- نور الانوار شرح المنار ج ۲ ص ۸۵ نیز ملاحظہ فرمائیں، تفتازانی- التلویح شرح التوضیح ج ۲ ص ۱۴۴ [3] سرخسی- اصول السرخسی، ج ۲ ص ۱۱ نیز ملاحظہ فرمائیں- شیرازی- کتاب اللمع، ص ۴۷، عبد العلی بحر العلوم- فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، ج ۲ ص ۱۳۹-

من شعیر [1]	طور پر دو۔

ابی سعید خدری کی حدیث یہ ہے:

کنا نخرج زکاۃ الفطر صاعاً	ہم صدقۂ فطر ایک صاع طعام نکالتے
من طعام [2]	تھے۔

عبد اللہ بن ثعلبہ کی حدیث کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ محکم ہے اور متن کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔ اس لئے علمائے اصول کی رائے میں راوی پر صغر سنی کا اعتراض لگانے سے حدیث مطعون شمار نہیں ہوگی [3]

۸- احادیث کم روایت کرنا: اگر کسی راوی کو احادیث بیان کرنے کی عادت نہ ہو تو محدثین کے نزدیک اس کی روایت قبول نہیں کی جاتی، لیکن علمائے اصول کے نزدیک معتبر راوی کا متقی ہونا ہے نہ کہ کثرت سے روایت کرنا۔ صحابۂ کرام میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے، لیکن کوئی ان پر یہ اعتراض کر سکتا ہے؟ صحابۂ کرام میں سے کچھ وہ تھے جو ہر وقت احادیث بیان کرنے سے روکتے تھے اور بعض ہر وقت روایات بیان کرتے رہتے تھے۔ لیکن علمائے اصول کسی کی روایت کو زیادہ روایات بیان کرنے کی وجہ سے ترجیح اور کم روایتوں کی وجہ سے رد نہیں کر سکتے [4] کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک بدوی کی روایت ہلال رمضان کے بارے میں قبول کی تھی، حالانکہ وہ روایات بیان کرنے کا عادی نہیں تھا [5]

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۴۳۲ (حدیث عبد اللہ بن ثعلبہ بن صغیر) [2] سنن ابی داؤد- ابواب الزکاۃ باب صدقۃ الفطر، حدیث نمبر ۱۶۳۳ [3] نسفی- کشف الاسرار، شرح المنار، ج ۲ ص ۸۵ [4] سرخسی- اصول السرخسی، ج ۲ ص ۱۱، نیز ملاحظہ فرمائیں: جامع ترمذی- ابواب الصوم، باب ماجاء (بقیہ حاشیہ ص ۳۵۸)

۹۔ فقہ کے فروعی احکام زیادہ بیان کرنا: غیر معتبر اعتراضات میں سے ایک فقہ کے فروعی احکام زیادہ بیان کرنا ہے۔ جیسے بعض محدثین امام ابو یوسف پر یہ اعتراض لگاتے ہیں[1]۔ حالانکہ یہ اعتراض کوئی عیب نہیں بلکہ اس شخص کے اجتہاد، بہترین حافظہ اور تقوی کی دلیل ہے کہ وہ ہر وقت امت کے لئے مسائل کا حل تلاش کرکے ان کو سہولت میسر کرنے میں مشغول رہتا ہے۔ یہ ایک خوبی ہے نہ کہ طعن[2]۔

(ب) معتبر اعتراض: اگر اعتراض اس قابل ہو کہ حدیث کو مطعون بنا دے تو اس کی دو وجہیں ہوں گی۔ ۱۔ طعن بسبب اجتہاد ۲۔ طعن متفق فیہ

اجتہادی مسائل کی وجہ سے اعتراض: اگر اجتہادی مسائل میں اختلاف مثلاً نبیذ پینے والے کو فاسق کہہ کر اس کی روایت رد کرنا یا ذبیحہ پر عمداً بسم اللہ نہ پڑھنے والے کو فاسق کہنا اور اس طرح کے بے شمار مسائل میں اختلاف کے سبب طعن ہو تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور حدیث مطعون شمار نہیں ہوگی[3]۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۷) فی الصوم بالشہادۃ۔ عبدالحق حقانی۔ النامی شرح الحسامی، ج ۱ ص ۱۵۴۔ ابوالولید باجی۔ احکام الفصول فی احکام الاصول، ص ۲۹۳ (حاشیہ ص ہذا) [1] عبدالعزیز بخاری۔ کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، ج ۳ ص ۹۵، [2] ملا جیون۔ نور الانوار، ج ۲ ص ۸۳، نیز ملاحظہ فرمائیں، تفتازانی۔ التلویح شرح التوضیح، ج ۲ ص ۱۴۴ [3] سرخسی۔ اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۱، نیز ملاحظہ فرمائیں، مولوی شریف۔ شرح التوضیح، ج ۲ ص ۱۴۴۔

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

از ضیاء الدین اصلاحی

قیمت حصۂ اول: ۶۵ روپے: دوم ۱۶۰ روپے: سوم ۷۰ روپے۔

تاریخ گوئی کا موجودہ انداز و اسلوب

از ڈاکٹر آفتاب احمد خاں

(۲)

اگرچہ آزادی کے بعد عموماً سالم مادے حاصل کرنے کا میلان ہے تاہم بعض دفعہ تاریخ گو اپنی پرگوئی اور مشاقی کے طور پر صنعتِ ترصیع وغیرہ میں بھی تاریخیں برآمد کرتے رہے ہیں جیسا کہ نضل لکھنوی نے شہزادہ مہر قدر کے انتقال (۱۹۶۱ء) پر ایک مرثیہ بعنوان "رفعتِ تاریخ" (۱۹۶۱ء) میں ہر ایک مصرع سے مختلف سنین نکالے ہیں۔ یہاں بخوفِ طوالت صرف ایک شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے:

راہبر دنیا میں تھے جب تک جناب مہر قدر ~~ ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء ~~ حق طلب باقی تھی کچھ تو عزت و شانِ اودھ[1]

قمر سنبھلی کو قدرت نے شاعری کے ساتھ تاریخ گوئی میں بھی اچھی استعداد عطا کی تھی وہ عموماً سالم الاعداد اور تعمیہ میں برمحل تاریخیں کہتے ہیں۔ نموتاً ان کے صرف دو قطعاتِ تاریخ پیش ہیں۔ محمد نوح نوح ناروی کی وفات پر "آہ ناخدائے سخن" (۱۳۸۲ھ) کے تاریخی عنوان سے قمر صاحب کا دو بیتی قطعہ ہے:

نوح تھے کامیاب تغزل ~~ ڈھل گیا اُف شبابِ تغزل

ہے قمر بس یہ تاریخ رحلت

[1] نقوش لاہور خطوط نمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۱۰۔

چھپ گیا آفتاب "تغزل"[1] ۱۹۶۲ء

اگرچہ مادہ عمومی نوعیت کا حامل ہے مگر الہامی محسوس ہوتا ہے۔ دوسرا قطعہ صمد یار خاں ساغر نظامی کے انتقال (۱۹۸۴ء) پر تعمیۂ تخرجہ میں "ساغر" کی مناسبت اور رعایت لفظی کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی برمحل تاریخ برآمد کی ہے:

ایک رندِ سخن کے سونے سے ہوا میخانۂ سخن سونا

چھن گئی ہے "مے ادب" افسوس ۵۷

آج "ساغر شکست" ہونے سے[2] ۲۰۴۱ = ۱۹۸۴ء

مادہ "ساغر شکست" کی رعایت سے "مے ادب" کے تخرجہ کا قرینہ برجستہ اور خوبصورت ہے۔ اگرچہ مادہ پورا مصرع ہونا چاہئے تھا لیکن مذکورہ تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ قطعہ اگر دوبیتی ہے تو مادہ بھی دو لفظی یعنی "ساغر شکست" اور تخرجہ بھی دو لفظی "مے ادب" جس کے (۵۷) عدد کا فنکارانہ اسقاط "ساغر شکست" کی رعایت سے کیا ہے۔

اردو کی مشہور افسانہ نویس و ناول نگار خدیجہ مستور کی شخصیت اردو داں طبقہ کے لئے محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی رحلت (۱۹۸۲ء) پر کسی نے صنعتِ مرموز میں دو قطعات کہے جو ان کے لوحِ مزار پر باہر اور اندر کی جانب کندہ ہیں۔

مرتے دم تک یہ بصیرت وجہ حیرت ہے بہت قصرِ خلد آنکھوں میں، پھر بھی لب پہ قدرِ آفاق کی

بجھ رہی تھی شمعِ ہستی، تب خدیجہ نے کہا

ماہ و انجم کی یہ دنیا خوبصورت ہے بہت[3] ۱۹۸۲ء

[1] و [2] مکتوب قمر سنبھلی صاحب محررہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۱ء دہلی [3] مقالہ الواح الصنادید از پروفیسر محمد اسلم صاحب مشمولہ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ بابت اکتوبر ۱۹۸۲ء ص ۳۰۳۔

دوسرا قطعہ جو اندر کی جانب کندہ ہے ذیل میں درج ہے:

اٹھیں نکہاتِ خدیجہ مستور چمنِ عشقِ نبیؐ میں آ کر

اسی گل پوش لحد سے ابھرے

ماہِ درجاتِ خدیجہ مستور[1] ۱۹۸۲ء

کسی شاعر کے مشہور شعر یا رباعی وغیرہ سے تاریخ برآمد کرنا حالانکہ اتفاقی امر ہے لیکن یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب کہ شعرا مرکے اشعار مستحضر ہوں۔ شعر یا مصرع سے کبھی مکمل مطلوبہ عدد حاصل ہو جاتے ہیں اور کبھی بہ سبب ضرورت ان میں معمولی تغیر و تبدل یا تدخلہ و تخرجہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں گزشتہ صفحات وابواب میں پیش کی جا چکی ہیں، جوش ملیح آبادی کی وفات کا سال جوش ہی کی ایک رباعی کے آخری مصرع سے بلا کسی ترمیم و تحریف کے حاصل کیا ہے جو نصیر ترابی کی کاوشِ فکر کا بہترین نمونہ ہے:

مولائے اکابرِ جہاں ہوں اے جوش دانائے رموزِ این و آں ہوں اے جوش

"میں شاعرِ آخر الزماں ہوں اے جوش"[2] ۱۹۸۲ء کیوں اہلِ نظر پڑھیں نہ کلمہ میرا

ڈاکٹر سید احمد (مکماسٹر یونیورسٹی، کینیڈا) لکھتے ہیں کہ اس تاریخ میں صرف شاعر کا تخلص ہی شامل نہیں، بلکہ باوجود شاعرانہ تعلی کے اس میں شاعر کی اپنے متعلق رائے کا نچوڑ بھی ہے اور "شاعرِ آخر الزماں" کی شوخی کی تو داد دینا محال ہے کہ ایسی تاریخ آج تک نہ کسی کو میسر ہوئی ہے اور نہ آئندہ کسی کو میسر ہونے کا بہت زیادہ امکان ہے[3]۔

(مشرقی پاکستان) بنگلہ دیش کے شعراء نے بھی ۱۹۴۷ء کے بعد پیچیدہ صنائع سے ہٹ کر

[1] مقالہ الواح الصنادید از پروفیسر محمد اسلم صاحب مشمولہ "ماہنامہ" معارف اعظم گڑھ بابت اکتوبر ۱۹۸۲ء ص ۳۰۴ [2] و [3] لغاتِ ابجد شماری ورق ۴۸ و ۴۹ نیز مطبوعہ ص ص ۵۵ و ۵۶۔

عام طور پر تاریخیں موزوں کی ہیں۔ حکیم سید ابوالعلا سعید احمد ناطق لکھنوی کی رحلت پر مشہور تاریخ گو اور بیسویں صدی میں بنگال کے سب سے بڑے شاعر خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے درج ذیل قطعۂ وفات کہا:

ناطق لکھنوی ہوئے بزم جہاں سے منتقل   شاعر نکتہ سنج کی آج ہوئی زباں خموش

سال وفات کی جو فکر وحشتِ خستہ دل نے کی

ہاتفِ غیب سے سُنا: ناطق رازداں خموش[1] ۱۳۹۶ھ

وحشت صاحب کے مادے رواں، صاف اور شستہ و رفتہ ہوتے ہیں اور برجستگی مزید چنانچہ کیپٹن عبدالصمد قمر صدیقی کے انتقال کا قطعہ ملاحظہ ہو:

رخصت ہوئے ہم سے قمر نیک خصال   ارباب وفا میں تھے وہ آپ اپنی مثال

کہہ زینتِ فردوس قمر صدیقی ۱۳۷۱ھ

تاریخ کا جو وحشت جو تجھے آئے خیال[2]

اس تاریخ میں مادۂ وفات تاریخی شعر کا مصرعِ اولیٰ ہے اور قول شاعر مصرعِ آخر۔ شاعر اس سلسلہ میں آزاد ہے کہ وہ قطعہ کے جس مصرع کو چاہے مادہ بنائے۔

علامہ محی الدین تمنا عمادی پھلواروی بھی اس فن میں ذوق سلیم رکھتے تھے۔ یہاں ان کے صرف دو قطعے پیش ہیں۔ خواجہ اسماعیل ذبیح کی وفات پر مولانا تمنا نے یہ عمدہ قطعۂ تاریخ کہی:-

اب تمنا ہے اور دل کا درد   دردِ دل کے تھے جو مسیح، گئے

[1] بنگلہ دیش کے اردو ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ وفات، مشمولہ سہ ماہی "اردو ادب" نئی دہلی شمارہ نمبر ۲ ۱۹۹۰ء ص ص ۵۰ تا ۵۳

پھر تاریخ آہ کس منھ سے

کہئے: "اب خواجہ ذبیح گئے"[1] ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۸ء)

قطعہ سوز سے پُر ہے جس سے باہم یگانگت و الفت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ محمد سمیع الحق کے ارتحال (۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء) پر مولانا تمنا عمادی کا درج ذیل قطعہ بھی ملاحظہ ہو:-

درِ بہشت پہ پہنچا تو وہ وہیں پہ ملے   بہت ہی شاد نمایاں ہر اک ادا سے خوشی

تو حال وسال کا میں نے کیا سوال ان سے

کہا: "بہشتِ بریں میں رسائی آج ہوئی"[2] ۱۳۸۵ھ

مکمل قطعہ ندرتِ فکر کا حامل ہے جو بالکل اچھوتے انداز میں کہا گیا ہے مزید یہ کہ مولانا کی گرفت اصول تاریخ گوئی پر بھی مضبوط ہے۔ چنانچہ دونوں تاریخوں کے مادوں میں "گئے" رسائی اور ہوئی"، میں انہوں نے "گئے" اور "ئی" کے ہمزہ بینی عدد شمار میں لیے ہیں۔ مولانا مرحوم نے اپنی وفات سے چھ سال قبل اپنی چند تاریخہائے انتقال بزبان عربی و فارسی کسی قبولیت کی ساعت میں خود کہی تھیں جو درست ثابت ہوئیں۔ ان میں سے فارسی کا ایک مادہ یہ ہے:

"تمنا عمادی المجیبی رفت"[3] ۱۳۹۲ھ

پروفیسر رشید الرحمٰن ارشد کاکوی کے ارتحال (۱۹۶۳ء) پر جمیل مظہری کا درج ذیل قطعہ بھی قابلِ توجہ ہے:

فکرِ سنِ رحلت میں تخیل تھی درماندہ   پلکیں جو ذرا جھپکیں توفیق ہوئی نازل

طاری جو ہوئی دل پر کیفیتِ وجدانی

حافظ نے کہا: "ارشد تھے دولت مستعجل"[4] (۱۹۶۳ء)

[1] بنگلہ دیش کے اردو ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ وفات، مشمولہ سہ ماہی "اردو ادب" نئی دہلی شمارہ نمبر ۲ ۱۹۹۰ء ص ص ۵۰ تا ۵۳
[2] ایضاً [3] سہ ماہی "اردو ادب" نئی دہلی، ش ۲ ص ص ۵۶ و ۵۳ [4] ایضاً۔

"دولتِ مستعجل" وہ دولت ہوتی ہے جو جلد جاتی رہے یعنی ناپائیدار۔ جمیل قولِ شاعر میں حافظ شیرازی کو لائے ہیں کیونکہ مادہ حافظ کے درجِ ذیل شعر سے ماخوذ ہے:

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی ۔ خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود

(یعنی سچ تو یہ ہے کہ بو اسحاق کے فیروزہ کی مہر خوب چمکی، لیکن وہ ایک دولت مستعجل تھی)

آزادی کے بعد سید مسعود حسن مسعود کا عندلیبِ تواریخ (۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء) کے تاریخی نام سے ایک ضخیم مجموعۂ قطعاتِ تاریخ منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے انفرادی حیثیت کا حامل ہے کہ اس میں نکاتِ تاریخ گوئی کے چند صفحات کو چھوڑ کر لوح سے تمت تک صرف تاریخی قطعات ہیں اور ان کی مجموعی تعداد ۲،۷۵ ہے۔ یہ تاریخیں مسعود صاحب (م ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء) کے ایک زبردست تاریخ گو ہونے کی دلیل ہے۔ اس مجموعہ میں فارسی زبان کے قطعات کی تعداد بہت کم ہے اور صنائع بدائع کی پیچیدہ تاریخوں کے بجائے جدید اسلوب یعنی تقریباً سالم الاعداد اور تعمیہ[1] میں ہی بیشتر مادے فراہم کئے ہیں۔ یہاں چند قطعات ملاحظہ ہوں، جن سے عہدِ جدید کی تاریخ گوئی کے عام رنگ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی وفات (۱۹۳۱ء) کا قطعہ ہے:

جوہر تخلص اور محمد علی تھا نام ۔ بعد وفات پائی جگہ جنت النعیم
تھی ذات ان کی فخر علیگڑھ کے واسطے ۔ اور شہر رامپور کے باشندۂ قدیم

لندن میں موت بیت مقدس ہے جائے دفن
مسعود ہے وفات کا سن: "فاضل عظیم"[2] ۱۹۳۱ء

[1] فارسی میں تدخلے کو تعمیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن از روئے لغت "تعمیہ" تدخلے اور تخرجے دونوں کو محیط ہے۔ کاش اردو والے تعمیہ کے بجائے تدخلہ کو رواج دیتے [2] ملاحظہ ہو "عندلیبِ تواریخ" ص ص ۱، و ۴۹ ناشر ادارۂ انیسِ اردو، الہ آباد، بار اول ۱۹۶۳ء۔

مذکورہ قطعہ سے نہ صرف مولانا کا سالِ وفات ہی معلوم ہوتا ہے بلکہ ان کی حیاتِ مستعار کی مختصر تاریخ بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ گو مادہ عمومی ہے جو اس سال رحلت کرنے والی کسی بھی شخصیت پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

مسعود صاحب نے وفیات کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی قطعات کہے ہیں۔ آزادی وطن پہ ایک مبسوط قطعہ کا پہلا اور آخری شعر پیش ہے:

کانگریس کا ہے گرم یوں بازار ۔ کہ یہ ملک ارتقا پہ ہے تیار

لکھ دو مسعود سالِ آزادی
ہند اچھا ہوا ہے خود مختار[1] ۱۹۴۷ء

خان بہادر مسعود حسن مسعود نے معنوی تاریخوں کے ساتھ بہت سی صوری تاریخیں بھی موزوں کی ہیں بطور مثال تنسیخِ زمینداری (۱۹۵۲ء) سے متعلق ایک صوری تاریخ بھی ملاحظہ ہو قطعہ مبسوط ہے جس میں زمینداروں کا حالِ زار کا موثر نقشہ کھینچا ہے۔ یہاں قطعہ کے صرف تین ۳ اشعار پیش ہیں:

ہمیں گھیرے ہوئے ہے بے طرح اب رنجِ ناداری ۔ زمینداری کے استیصال سے ہے زندگی بھاری
مرغن سب غذائیں بادلِ ناخواستہ چھوٹیں ۔ چڑھاتی ہے فقط منھ آکے گھر میں دال ترکاری

- -

ملی مسعود کو یہ صوری تاریخ ہاتف سے
ہوئی انیس سو باون میں تنسیخ زمینداری[2]

[1] ملاحظہ ہو "عندلیب تواریخ"، ص ص ۱، و ۴۹ ناشر ادارۂ انیس اردو، الہ آباد، بار اول ۱۹۶۳ء
[2] ایضاً، صفحات ۹۶، ۲۵۲ و ۲۵۳، ۶۷، ۲۳۸ نیز ۲۴۔

عندلیبِ تواریخ میں مساجد اور دیگر عمارات، باغات و پارک وغیرہ کی تعمیر سے متعلق متعدد تاریخیں ہیں۔ یہاں ان سے صرف نظر کرتے ہوئے چند ایسی تاریخیں پیش کی جا رہی ہیں جن میں مزاح اور طنز و ظرافت کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ کھیری کے میاں مسعود احمد پیرزادے کا انتقال ہوگیا۔ اسمی مماثلت کے سبب پاکستان میں جناب مسعود صاحب کی وفات کی خبر پھیل گئی۔ اس سلسلہ میں مسعود صاحب کے اہلِ خانہ کو شفیع الدین کرمانی صاحب کا ایک تعزیت نامہ موصول ہوا جسے پڑھ کر موصوف (مسعود صاحب) نے قطعۂ ذیل بعنوان "تاریخ ازالۂ غلط فہمی" سپردِ قلم کیا جو ظرافت کا اچھا نمونہ ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

شفیع الدین کرمانی ذرا یہ تو بتا دیجے   کہ پاکستان میں قائم ہے کیوں میرا عزا خانہ
ابھی تو میری شمعِ زندگی میں نور باقی ہے   نگاہوں سے ابھی اوجھل ہے تربت کا سیہ خانہ

....

ہوا کھانے گیا تھا خلد میں، یہ فرض کر لیجے   مگر رہا تھ آیا واپسی کا مجھ کو پروانہ
میاں مسعود احمد پیرزادے تھے جو کھیری کے   سدھارے چھوڑ کر دنیائے فانی کا صنم خانہ
غلط فہمی ہوئی احباب کو ہمنام ہونے سے   زباں زد ہوگیا مخلوق میں بے کیف افسانہ
بہر صورت صمیمِ قلب سے میں پیش کرتا ہوں   دعائے مغفرت ہونے کا قبل از وقت شکرانہ

شفیع الدین یہ تاریخ ہے بامنتِ ایزد
کہ ہے زندہ ابھی مسعود باشانِ قدیمانہ[1]   ۱۳۸۰ھ (۶۱-۱۹۶۰ء)

بظاہر مادہ کافِ بیانیہ سے شروع معلوم ہوتا ہے مگر دراصل تاریخ "منت ایزد" سے "باشانِ قدیمانہ" تک ہے۔ ہزل گو شاعر ڈاکٹر احمد اللہ عباسی ایجنٹ فراہمی مال کی ولادت کا

---

[1] ملاحظہ ہو عندلیب تواریخ کے صفحات ۹۶، ۲۵۲ و ۲۵۳، ۶۷، ۲۳۸ نیز ۲۴۔

سال بھی مزاحیہ انداز میں برآمد کیا ہے:

ڈاکٹر خوش مزاج خوش اطوار   کرتے رہتے ہیں تو بہ استغفار

مصرعِ سال یہ ملا مسعود
صاحبِ مال، مرغِ زار و نزار[1]   ۱۸۸۴ء

مسعود صاحب نے "سہروں" میں بھی کئی تاریخیں برآمد کی ہیں۔ بطور مثال یہاں صرف ایک تاریخ پیش ہے:

عیسوی سنہ کا یہ ہے مصرعۂ دوشن مسعود   باریابِ رخِ شاہاں ہے منور سہرا[2] ۱۹۵۵ء

مسعود کے تاریخی سہرے کہنے کے سلسلہ میں رگھونندن پرشاد مخمور جہاں آبادی لکھتے ہیں کہ "سہرے میں تاریخ کا شامل کرنا آپ (مسعود) کی خاص ایجاد ہے۔"[3]

لیکن مخمور جہاں آبادی کے برخلاف مولانا عبد السلام ندوی سہرے کی ایجاد کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ

"یہ معلوم نہیں کہ سہرے کا موجد کون ہے تاہم اردو کے سوا اس کا پتہ اور زبانوں کی شاعری میں نہیں ملتا۔ اس لئے یہ اردو کی خاص چیز ہے" سہرے کی تعریف "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ "کسی نوشہ یعنی دولہا کی تعین کا بیان ہو تو سہرا، مہندی، ساچق، وداع کے اسم سے حسبِ حال مسمی ہوتا ہے، ان

[1،2] ملاحظہ ہو عندلیب تواریخ کے صفحات ۹۶، ۲۵۲ و ۲۵۳، ۶۷، ۲۳۸ نیز ۲۴ [3] "رسم حنا بندی، بری، برات سے ایک روز پیشتر کی رسم جس میں دولہا کے ہاں سے مہندی، نُقل (مٹھائی) مصری، سہاگ پڑا، پھلیل، جوڑا، عطر وغیرہ آرائش کے لئے کچھ آدمی لے کر جاتے ہیں۔ اگر دولہا کو خلعت ملتا ہے تو وہ بھی آج ہی کے دن جایا کرتا ہے"۔ اسے ساچق کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو فرہنگ آصفیہ ۳: ۵۴۳۔

چاروں قسم کا بیان مرثیہ میں اکثر شایع ہے اور غالباً ہمارے شعرا نے مرثیہ ہی سے اس صنعت کو لیا ہے[۱]۔

چنانچہ محمود جہاں آبادی کے برعکس ہماری معلومات کی حد تک سہرے میں تاریخ شامل کرنے کی ایجاد کا سہرا سید غلام حسین قدر بلگرامی کے سر ہے جنھوں نے صنعت صبح میں صاحبزادہ ڈپٹی مرزا عباس بیگ کی شادی (۱۸۷۷ء) کے موقع پر کہا تھا۔ اس سہرے میں کل نو اشعار ہیں جس کے ہر مصرع سے مطلوبہ سال نکلتا ہے۔ یہاں صرف مطلع پیش ہے:

ہو شکلِ شاہانہ دکھاتا ہے چمک کر سہرا ۱۸۷۷ء
آئینہ منہ سنہ بخت سکندر سہرا ہے[۲] ۱۸۷۷ء

ہو سکتا ہے قدر سے پہلے بھی کسی نے تاریخی سہرا کہا ہو لیکن تلاش و جستجو کے باوجود ہمیں تاریخ میں کوئی سہرا نہیں مل سکا البتہ بعد ازاں بہت سے تاریخ گو شعرا نے تاریخی سہرے کہے مثلاً محمد حنیف علی رعب بھی ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں تاریخی سہرا کہہ چکے تھے[۳]۔ یہاں ان کا ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۵-۱۶ء) میں کہا گیا ایک دوسرا قطعہ پیش ہے جو مولانا محمد یوسف رنجور عظیم آبادی (م ۱۹۲۳ء) کے فرزند کی عروسی سے متعلق ہے جو نہایت لطیف تدخلے سے ہے:

احباب تہنیت گو، رنجور شاد و خرم — دیکھا بوقتِ پیری اک نوجواں کا سہرا
لکھیے سنینِ شادی رنجور ہی کے دل سے ۳
رنجور کو مبارک آرامِ جاں کا سہرا[۴] ۱۳۳۱ + ۳ = ۱۳۳۴ھ

مادہ کے اعداد میں تین عدد کم تھے اس لئے ماہر تاریخ گو نے لفظ "رنجور" جو پانچ[۵]

---

[۱] شعر الہند ۲: ۳۸۶ مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۸۰ء [۲] نقوش لاہور، اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۱۱۰ [۳] بحوالہ کلیاتِ رعب ص ص ۷، ۸، ۳۰۷، نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۲ء [۴] ایضاً۔

حرفی ہے، کے درمیانی حرف (ج) کے (۳) عدد ماہرانہ انداز میں شاملِ اعدادِ مادہ کرتے ہوئے حرفی تدخلے کی بہترین مثال پیش کی ہے نیز ایہام کا لطف مزید برآں۔

بعد ازاں دیگر شعرا خصوصاً نواب سید محمد جعفر علی خاں جعفر شمس آبادی اور حافظ جلیل حسن جلیل مانکپوری نے بھی تاریخی سہرے کی روایت کو آگے بڑھایا[۱]۔

دورِ حاضر میں ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب جلیل القدر تاریخ گو ہیں اور شروع سے ہی انہیں اس فن سے غیر معمولی تعلق رہا ہے۔ موصوف نے اردو میں ہر طرح کی مختلف صنایع میں تاریخیں کہی ہیں جو زیادہ تر سالم الاعداد اور تعمیہ میں ہیں۔ صنعتِ ضرب میں اپنے ایک دوست کے تیسرے نکاح کی تاریخ یوں برآمد کی ہے:

تاریخ عقدِ ثالث مل جائے تم کو فوراً
آجائے ان کے لب پر جب تین بار خندہ[۲] ۳ × ۶۵۹ = ۱۹۷۷ء

فریدی صاحب لفظی تدخلہ انتہائی کاوش، ہنرمندی اور ماہرانہ طور پر کرتے ہیں۔ شاہ فیصل کی شہادت کے درج ذیل دوبیتی قطعہ میں اس کی نظیر ملاحظہ ہو جو صنعتِ خالی میں ہے:

اس کو شہادتِ شہِ فیصل کا غم ملا — سنبھلی نہ تھی جو قوم ابھی ناصر کے داغ سے
تاریخِ قتلِ شاہ ملی ہے بُکا کے ساتھ ۲۳
"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"[۳] ۱۹۵۲ + ۲۳ = ۱۹۷۵ء

---

[۱] دیکھئے دفترِ تاریخ جلد ہشتم ص ۴۳ طبع ۱۹۲۰ء لکھنؤ اور جان سخن ص ص ۲۲۵-۲۲۶ طبع ۱۹۱۶ء لکھنؤ [۲] صنادید تاریخ گوئی از پروفیسر محمد انصار اللہ ص ۲۶۵ [۳] سہواً حوالہ نوٹ نہ کر سکا۔ مصرع مادہ کا پہلا مصرع ہے: دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے۔ یہ مشہور شعر (بقیہ حاشیہ ص ۳۷۰ پر

ڈاکٹر زیدی صاحب نے مذکورہ تاریخ اگر لفظی تدخلے سے کہی ہے تو لفظی تخرجہ کو بھی ماہرانہ انداز میں برتا ہے۔ بطور مثال شیخ عبداللہ کی وفات کے قطعہ کا تاریخی شعر ملاحظہ ہو:

بے بہا لعل کھو کے سال ملا | شیر کشمیر شیخ عبداللہ[1] ۱۵۰- ۲۱۳۲ = ۱۹۸۲ء

زیدی صاحب کی ایک مزاحیہ تاریخ بھی نمونتاً درج کی جاتی ہے جو ایک ایسی شادی کی ہے جس میں دولہا دولہن دونوں شباب کی حد سے گزر چکے تھے ؛ یہ تاریخ یک لفظی ہے:

پایا اثر دعا نے خدا کی جناب سے | سب فیضیاب ہیں کرم بے حساب سے

دونوں گزر گئے ہیں جو حد شباب سے

تاریخ عقد مل گئی لفظ خضاب سے[2] ۱۴۰۳ھ

بہرحال ڈاکٹر مغیث الدین فریدی کی تاریخ خواہ سالم مادہ میں ہوں یا صنعت ضرب اور خواہ تعمیہ میں، ہر موقع پر اپنی برجستگی اور موقع ومحل کی مناسبت کو برقرار رکھتی ہیں جو عصری تاریخ گوئی کے عام رجحان ومیلان کو واضح کرتی ہیں۔ افسوس کہ موصوف نے ابھی تک اپنے قطعات تاریخ کو کتابی شکل میں شایع نہیں کرایا ہے۔ موصوف کو اس فن کے اصول ومبادیات پر گہری بصیرت حاصل ہے۔

دور حاضر کی تاریخ گوئی کا ایک اہم رجحان یہ بھی ہے کہ جدید سائنسی ترقیات کے سبب جو حیرت انگیز کارنامے وجود میں آرہے ہیں وہ بھی اس فن کا موضوع بن رہے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں چاند کی دھرتی پر انسان نے جب پہلا قدم رکھا تو یہ تاریخ انسانی کا عظیم الشان

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶۹) بقول کالی داس گپتا رضا پنڈت مہتاب رائے تاباں دہلوی کے اس شعر کی قدرے ترقی یافتہ شکل ہے:

شعلہ بھڑک اٹھا مرے اس دل کے داغ سے | آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے (معمور سراغ ص ۱۳۱ مطبوعہ ۱۹۸۰ء بمبئی)

[1] و [2] مکتوب گرامی مورخہ ۲۱ر ستمبر ۱۹۹۶ء۔

کارنامہ تھا۔ امریکی خلابازوں کی اس کامیابی نے حکیم عزیز قدوسی کامٹوی کے ذہن کو جس طرح متاثر کیا اس کا اندازہ درج ذیل قطعہ تاریخ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے:

کامرانی کوشش پیہم سے ہوتی ہے نصیب | اس میں کوئی شک نہیں یہ کارنامہ ہے بڑا

آفریں صد آفریں پہنچا زمیں سے چاند پر

آج تاریخی سفر پورا ہوا انسان کا[1] ۱۹۶۹ء

شمیم امروہوی کو اس فن سے خصوصی دلچسپی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ملک وبیرون ملک جو مختلف نوعیت کے واقعات وحادثات مثلاً سیاسی، سماجی، قدرتی آفات اور ولادت ورحلت اور کھیل کود (ایشیاڈ) وغیرہ پیش آئے۔ ان سب سے متعلق شمیم نے قطعات کہہ کر انہیں "انیس سو بیاسی" کے نام سے کتابی شکل میں شایع کرایا۔ شمیم کو تاریخ گوئی کی مختلف صنعتوں پر عبور حاصل ہے۔ ان کے بعض قطعات ہم پایاں نامہ کے باب دوم "اقسام اور صنائع" کے ذیل میں پیش کرچکے ہیں۔ یہاں صرف چند تاریخیں پیش کی جاتی ہیں:

مسرت علی خاں اور ان کے ہم زلف رفعت علی خاں ایک ساتھ قتل کر دئے گئے۔ اس سانحہ سے متاثر ہوکر شمیم نے جو تاریخ مشترک کہی، اس کا پہلا اور حالی تاریخ شعر ہے:

تعلق ہو آنکھوں کا دل سے اگر | نکلتے ہیں آنسوں مصیبت کے ساتھ

لکھو یوں کہ رفعت علی خاں شہید ۱۹۸۲ء

گئے نوجواں کو مسرت کے ساتھ[2] ۱۴۰۲ھ

مسرت کی رعایت سے تاریخ کا لطف دوبالا ہوگیا ہے، مزید یہ کہ دونوں مصرعے سالم الاعداد ہیں جن سے فاضل تاریخ گو نے عیسوی وہجری سنین فراہم کئے ہیں۔ اگرچہ پہلے مادہ میں "لکھو یوں کہ"

[1] ارمغان عزیز ص ۱۸۲، طبع ۱۹۸۱ء، ناگپور [2] انیس سو بیاسی ص ص ۹۷-۹۶۔

اصولی طور پر مادہ میں شامل نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن ایک خوبصورت تاریخ پر بعض دفعہ تاریخ گو اصول کو قربان کر دیا کرتا ہے۔

شمیم صاحب نے وفیات کے علاوہ بعض دیگر واقعات کی تاریخیں بھی خوب کہی ہیں۔ یہاں دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اس نوعیت کے قطعات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہمارے تاریخ گو نئے نئے موضوعات پر بھی قطعاتِ تاریخ کہہ کر اس واقعہ کو تاریخی (HISTORICAL) حیثیت دینے میں پیش رفت کر رہے ہیں۔ اگرچہ خال خال ماضی میں بھی زلزلہ وغیرہ کی تاریخیں کہی گئی ہیں۔[1]

۱۹۸۲ء میں شمالی یمن میں قیامت خیز زلزلہ آیا۔ شمیم نے اس سے متاثر ہو کر دو بیتی قطعہ کہا:-

اُجڑ سی ہوئی ہیں بستیاں زدِ خزاں کی ہے چمن ۔۔۔ محفل و بزم و انجمن قریہ و شہر و دشت و بن

ملہمِ غیب نے کہا مجھ سے یہ بن کے سوگوار

ہو گئی آج کیجئے شق ارضِ شمالی یمن[2] ۱۹۸۲ء

میرٹھ کے فرقہ وارانہ فسادات پر کہتے ہیں:

بگڑے ہوئے حالات کی زد میں کہئے ۔۔۔ رنج و غم و آفات کی زد میں کہئے

بھڑکے ہوئے شعلوں میں پکارا ہاتف

میرٹھ ہے فسادات کی زد میں کہئے[3] ۱۴۰۲ھ

---

[1] مثلاً ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء میں آگرہ میں زبردست زلزلہ آیا۔ کسی عصری شاعر نے تاریخ کہی جو صورتی ہے:

در نہصد و احدے عشر از زلزلہ ہا ۔۔۔ گردید سواد آگرہ چو مرحلہ ہا ۹۱۱ھ

با آنکہ بنا باشش ہمہ محکم بود ۔۔۔ از زلزلہ شد عالیہا سافلہا (واقعات دار الحکومت دہلی ۱: ۲۲۳ ح ط)

[2] آئینس سو بیاسی ص ص ۱۰۴، ۱۰۰، ۵۲ نیز ۲۴ و ۲۶ [3] ایضاً۔

اگرچہ اصولی اعتبار سے مادہ کے آخر میں لفظ "کہیے" جو قولِ شاعر ہے، شاملِ مادہ نہیں ہونا چاہئے تھا مگر چونکہ تاریخ جداگانہ نوعیت کی ہے اور اس کا موضوع بھی یکسر مختلف ہے۔ اس لئے عہدِ حاضر کی تاریخ گوئی کے وسیع میدان اور امکانات کی تفہیم میں یہ تاریخ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

۱۹۸۲ء میں ایشیائی کھیلوں کے دوران چین کے "ایشیائی چیمپئن" بننے پر جو قطعہ کہا اس کا تاریخی شعر ہے:-

شور ہے دہلی میں بعد اختتام ایشیاڈ ۔۔۔ برتری تسلیم کر لیں کھیل میں سب چین کی[1] ۱۹۸۲ء

آزادی کے بعد اگرچہ تاریخ جلوس کہنا کا زمانہ گزر گیا لیکن شمیم صاحب نے گیانی ذیل سنگھ کے صدر مملکت ہند منتخب ہونے پر ایک طویل قطعہ کہہ کر روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے:

جسے موقع ملا ہے ملک و ملت کی قیادت کا ۔۔۔ نمونہ ہے وفاداری کا پیکر ہے شرافت کا

....

نتیجہ آگیا لو انتخابِ صدرِ بھارت کا

وہ پہنچا ذیل سنگھ کو منصبِ عالی صدارت کا[2] ۱۹۸۲ء

ڈاکٹر ولی الحق انصاری اردو اور فارسی دونوں زبانوں اور مختلف سنین میں تاریخیں کہتے ہیں اور اس فن کے اصولوں پر بھی ان کی نظر ہے مگر بعض حروفِ متنازعہ کے اعداد اخذ کرنے کے سلسلے میں قدرے وسعت کے قائل ہیں۔ فارسی زبان میں ان کے قطعات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اسی انداز کے عددی تخرجے وغیرہ کرتے ہیں جیسے مغل عہد میں کئے

---

[1] آئینس سو بیاسی ص ص ۱۰۴، ۱۰۰، ۵۲ نیز ۲۴ و ۲۶ [2] ایضاً۔

جاتے تھے۔ یہاں مثال سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم ان کا ایک اردو میں کہا گیا قطعہ پیش کرتے ہیں جو انہوں نے جنرل حبیب اللہ (عنایت) کی وفات پر کہا تھا:

عنایت آج لئے اپنا نامۂ اعمال — ترے حضور میں اے کردگار آیا ہے
نہ لاسکا وہ جو لانا تھا اس کو دنیا سے — خطا شعار بہت شرمسار آیا ہے
ترے عتاب سے ترساں تو ہے مگر یارب
ترے کرم کا بھی امیدوار آیا ہے" ۱۴۱۰ھ

اس تاریخ میں مادہ کا ایک لفظ یارب مصرع اولیٰ میں ہے [1]

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صدر شعبۂ عربی دانش گاہ دہلی، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں برجستہ اور برمحل تاریخ کہنے میں ماہر ہیں اور اس فن کے قواعد وضوابط پر عمیق نظر اور مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔ چونکہ وہ تقریباً فرمائشی طور پر تاریخ کہتے ہیں اس لئے ان کے قطعات کی مقدار کوئی زیادہ نہیں ہے۔ لیکن کیفیت کے اعتبار سے وہ الہامی نوعیت اور بدیہہ گوئی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے آیت قرآنی سے اپنے والد بزرگوار کے سانحۂ رحلت کا مادہ یہ برآمد کیا:

"اغفرلی ولوالدیّ" ۱۴۰۷ھ (القرآن ۷۱: ۲۸)

اس تاریخ میں لطف یہ ہے کہ "والِدِیّ" کو "والدی" یعنی میرے والد بھی پڑھ سکتے ہیں اور "والدَیّ" یعنی میرے والدین بھی۔

راقم الحروف کی چھوٹی ہمشیرہ صبیحہ خانم نے بعمر گیارہ سال قرآن پاک حفظ کرنے کی

[1] گلزار معروف بہ نذر کامل عیار از پروفیسر ولی الحق انصاری ص ۸۲، نامی پریس لکھنؤ ۱۹۹۱ء
[2] مکتوب مرقومہ ۲۶ جون ۱۹۹۲ء۔

سعادت حاصل کی۔ فاروقی صاحب نے فارسی زبان میں اس تقریب کا درج ذیل قطعہ کہا:

زفضل حق بہ عمر یازدہ سال — ز قرآں نقش پاکش لامعہ شد
چو جستم سال حفظش با دل شاد ۱
ندا آمد: صبیحہ حافظہ شد [1] ۱۴۱۲ + ۱ = ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۳ء

یہ تمین لفظی مادہ ایک عدد کے تدخلے سے کہا گیا ہے جس کی طرف "با دل شاد" کہتے ہوئے اشارہ کر دیا ہے جو ذو معنی ہے۔ واضح ہو کہ اگر مادہ تمین لفظی ہے تو تدخلہ بھی تمین حرفی لفظ "شاد" کے درمیانی حرف "الف" سے کیا ہے جس کی عددی قیمت ایک ہے۔ اگرچہ اس نوعیت کی تاریخیں ایک عدد کی کمی بیشی سے بھی روا ہیں۔

استاد گرامی ڈاکٹر فیروز احمد صاحب کی تصنیف "تحریک آزادی اور راجستھان کے اردو شعراء (نغمات آزادی) ۱۹۹۳ء میں شایع ہوئی۔ اس کی اشاعت کا قطعہ فاروقی صاحب نے اردو میں کہا جو کتاب کے معنوی نام کی مناسبت کے سبب داد سے بے نیاز ہے:

جنگ آزادی میں متوالوں کے دل — اہل راجستھان نے گرمائے ہیں
آج تک سینوں میں جو محفوظ تھے — نغمے وہ پردے سے باہر آئے ہیں
ڈاکٹر فیروز احمد کے طفیل — اس سفینے میں وہ یکجا پائے ہیں
ثبت ہیں تاریخ آزادی میں آج
جو ترانے حریت کے گائے ہیں [2] ۱۴۱۳ھ

فاروقی صاحب کا یہ قطعہ کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ آخری شعر کے مصرع اولیٰ میں

[1] مکتوب موصولہ ۲۱ اگست ۱۹۹۳ء [2] تحریک آزادی اور راجستھان کے اردو شعراء، از ڈاکٹر فیروز احمد ص ۲۲، ناشر راجستھان اردو اکادمی جے پور ۱۹۹۳ء

لفظ "تاریخ" دو معنی استعمال ہوا ہے لیکن اضافت کے سبب آزادی سے مختص ہو گیا ہے جو صنعت مرموز میں ہے۔ تیسرے قطعہ کے اشعار مکمل تصنیف کے محتویات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چوتھے مادہ مکمل ہے جس کی امید ایک پختہ کار تاریخ گو سے ہی کی جاسکتی ہے۔

پروفیسر عبدالرب عرفان کو اس مشکل فن پر گہری نظر اور بصیرت حاصل ہے۔ موصوف کو دشوار سے دشوار قطعات تاریخ کو حل کرنے میں حظ و لطف حاصل ہوتا ہے۔ انہیں فارسی اور اردو میں قطعات تاریخ کہنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ اکثر غنائی بحروں میں تاریخ کہتے آئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر اردو اور فارسی زبان میں قطعات کہے۔ یہاں اردو قطعہ کے جو طویل ہے، صرف تین شعر پیش ہیں:

ہند کے اے رہبر ہر دلعزیز — کیوں نہ تیرے غم میں دل ہو داغ داغ

.... — ....

پا رہے ہیں تیرے کھو جانے کے بعد — ہم تلاش ہند سے تیرا سراغ

کہہ دو یوں عرفان تاریخ وفات

ہو گیا گل امن کا روشن چراغ[1] ۱۹۶۴ء

مولانا شریف کاملی کی وفات پر قطعہ نہ کہہ کر صرف مادہ موزوں کیا:

"اک جنازہ جا رہا تھا دوش پر تقدیر کے[2]" ۱۹۵۹ء

یہ مادہ شوکت علی خاں فانی بدایونی کے مندرجہ ذیل مقطع کے آخری مصرع میں معمولی تصرف کرتے ہوئے برآمد کیا ہے:

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو — اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

[1] ماہنامہ آج کل دہلی نہرو نمبر نومبر ۱۹۶۴ء [2] مکتوب گرامی ۳۰ جنوری ۱۹۹۶ء۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۶ء / ۱۴۱۶ھ کو موصوف صدر شعبۂ اردو و فارسی دانش گاہ ناگ پور سے سبکدوش ہوئے تو ایک سادہ فقرہ سے تاریخ برآمد کی:

یہ ریٹائرمنٹ کا دن ہے[1] ۱۴۱۶ھ

جناب کالی داس گپتا رضا بھی اس فن سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا صرف ایک قطعہ پیش ہے جو انہوں نے اپنی صاحبزادی رتا گپتا کی ولادت پر کہا تھا جو بہترین تخرجے سے ہے:

یوں رتا آئی ہے آنگن میں مرے — جاگ اٹھیں خوشیاں نراشا سو گئی

آج پھلواری میں کیا سکھ چین ہے — جیسے قسمت شانتی سی بو گئی

بعد بیٹے کے تمنا تھی ــــ یہی — لو سیاہی روشنی میں کھو گئی

کی نہ میں نے سال پیدائش کی فکر — صبح گزری دوپہر بھی ہو گئی

"دھوپ ڈھلتے ہی مگر دل نے کہا ۱۷

لکھ رضاؔ خوش بخت پیدا ہو گئی" ۱۹۷۶ = ۱۹۵۹ء

بیسویں صدی میں تاریخ گوئی کے عام انداز و اسلوب کی تفہیم کے سلسلہ میں اب تک جو مثالیں درج کی گئیں اور جن تاریخ گو شعراء کا ذکر کیا گیا ان کے علاوہ بھی ایسے اصحاب فکر ہیں جنھوں نے اس فن سے دلچسپی لی اور وقتاً فوقتاً مختلف واقعات کے تاریخی قطعات کہے مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد[3]، جوش ملیح آبادی[4] نیز طلحہ رضوی برق، رئیس امروہوی، کوثر

[1] مکتوب گرامی ۳۰ جنوری ۱۹۹۶ء [2] مکتوب میں تاریخ درج نہیں [3] برائے تفصیل ملاحظہ فرمائیں "مولانا ابوالکلام آزاد ـ شخصیت اور کارنامے" ص ۵۰۲ مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی دہلی ۱۹۸۸ء [4] دیکھئے ماہنامہ "نقوش" لاہور "خطوط نمبر" جلد دوم بابت اپریل، مئی ۱۹۶۸ء ص ۴۱۰۔

امروہوی اور خداداد خاں مونس بجے پوری حال مقیم اجمیر وغیرہ۔ یہاں ان سب کے تذکرے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تقسیم ملک تک عموماً ہر شاعر تاریخ گوئی میں بھی قابلیت بہم پہنچاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں بڑا شاعر ہونے کے لئے، جہاں یہ ضروری تھا کہ شاعر فن عروض کے ساتھ جملہ اصنافِ سخن پر عبور رکھتا ہو، وہیں یہ بات بھی شرائط میں داخل سمجھی جاتی تھی کہ فنِ تاریخ گوئی کا ماہر ہو[1] اس کڑی شرط کے سبب تاریخ گوئی میں مہارت نہ سہی مگر اس فن سے دلچسپی برقرار رہی اور چونکہ استادی و شاگردی یا شعرا کی جانشینی کی روایت کو قدر و منزلت حاصل تھی۔ اس لئے بیسویں صدی کے انتشار پرور ماحول میں تاریخ گوئی کی روایت کا سابقہ بھرم قائم رہا اور ان حضرات نے بھی تاریخیں موزوں کیں جنہیں واقعتاً اس فن سے طبعی تعلق نہیں تھا مثلاً مولانا آزاد اور جوش ملیح آبادی وغیرہ۔ لیکن جن شعراء کو اس دقیق فن سے یکساں لگاؤ تھا، انہوں نے مروجہ ادبی اقدار کے ساتھ ساتھ فن تاریخ گوئی کو بھی پروان چڑھایا اور چونکہ تقسیم ملک تک اردو کے ساتھ فارسی اور عربی شعر و ادب سے بھی واقفیت عام تھی اس لئے اکثر شاعروں نے اردو کے ساتھ فارسی میں تاریخیں کہیں اور معتد بہ تعداد میں قرآنی آیات و احادیث پاک سے بھی مادے برآمد کئے۔ اس کا سبب محض یہ نہیں کہ اردو کے مقابلہ فارسی یا قرآن پاک کی آیاتِ شریفہ سے مادے برآمد کرنا آسان ہے بلکہ یہ سبب بھی کارفرما رہا ہے کہ ہمارے بیشتر مقتدر شاعر ان زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے جن سے اردو نے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔ یہ استفادہ صرف اصنافِ شاعری تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ زبان و بیان کے اسلوب و نکات سے لے کر تشبیہات، استعارات، تراکیب، تمثیلات، محاورے اور ضرب الامثال تک پھیلا ہوا ہے۔ اس صورت میں یہ بات قطعی باعثِ حیرت نہیں کہ اردو کے

[1] دیکھئے مضمون بعنوان "ہندوستان میں سب سے بڑا شاعر کون" مشمولہ شاعر ص ۱۶ بابت ۱۵ مئی ۱۹۳۰ء

ساتھ فارسی یا عربی میں تاریخیں کیوں کہی گئیں؟ دراصل اردو میں تاریخ گوئی کی روایت ان ہی زبانوں کے توسط سے پروان چڑھی اور فیضیاب ہوئی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں اردو کے ساتھ مذکورہ زبانوں میں بھی تاریخ گوئی سے دلچسپی کا سبب واضح ہو جاتا ہے۔

لیکن جہاں تک اردو میں تاریخ گوئی کے موجودہ انداز و اسلوب کا سوال ہے تو یہاں چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر بلکہ بیسویں صدی کے ربع اول تک تاریخ گوئی عموماً روایتی انداز و اسلوب کے سہارے پروان چڑھی، یہاں روایتی انداز و اسلوب سے ہماری مراد ان تاریخوں سے ہے جن میں تاریخ گو شعوری طور پر مادہ ہائے تاریخ کو معما بنانے کا اہتمام کرتا تھا،[1] ایسی تاریخوں میں علم و فضل کے

[1] مثلاً اقبال جب گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کے متعلم تھے تب انہوں نے مولانا ابو سعید محمد شعیب کے "مختصر العروض" کا قطعۂ تاریخ لکھا جو کافی حد تک معما نما ہے، آخری تین[3] شعر دیکھئے:

پئے سال اشاعت غور کی اقبال نے جس دم — زبانِ ہاتفِ غیبی ہوئی اس طور سے گویا
دکھا کر یہ کتابِ بے بہا دل چھین لیتا ہوں — فصاحت کا، بلاغت کا، لیاقت کا ذہانت کا
ادب کے ساتھ سالِ طبع پھر یوں عرض کرتا ہوں — "جزاک اللہ لکھا ہے رسالہ مختصر کیسا" ۱۸۹۶ء

یعنی پہلے فصاحت، بلاغت، لیاقت اور ذہانت کا دل یعنی چاروں کے "الف" چھین کر چار عدد حاصل کئے پھر تاریخی مادے کے اعداد ۱۸۸۵ میں ادب کے سات عدد شامل کئے یعنی ۴ + ۷ + ۱۸۸۵ = ۱۸۹۶ء (دیکھئے باقیاتِ اقبال طبع سوم ص ص ۷۷-۷۸)

مذکورۂ بالا تاریخ کے برعکس، ۱۹۳۰ء میں کہا گیا اقبال کا ایک دوسرا قطعہ ملاحظہ فرمایا جائے جو انہوں نے سر سید احمد خاں کے پوتے سر راس مسعود کے ہاں لڑکی پیدا ہونے پر کہا تھا (بقیہ حاشیہ ص ۳۸۰ پر)

مظاہرے کے لئے تاریخ گو جس طرح مشکل اور پُرپیچ صنعتوں کا استعمال کرتا تھا اس سے اس فن پر شاعر کی کامل دسترس کا ثبوت تو ملتا ہی تھا ساتھ ہی اہلِ ذوق کی نظر میں تاریخ گو کی عظمت بھی بڑھتی تھی، مگر بیسویں صدی کے اوائل میں زندگی اور سماج کی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ادبی اقدار میں جس تیز رفتاری کے ساتھ نئے پن کا احساس بڑھا، اس کے سبب نہ صرف بعض اصنافِ شاعری مثلاً قصیدہ کا بھرم ٹوٹا بلکہ تاریخ گوئی کے سابقہ انداز سے روگردانی بھی ضروری خیال کی گئی، صنعتوں کے اہتمام کے ساتھ برمحل مادہ ہائے تاریخ پہلے بھی کہے گئے ہیں، لیکن بیسویں صدی میں سادگیٔ بیان اور حشو و زوائد سے پاک جس برجستہ انداز میں تاریخیں کہی گئیں، ان سے تاریخ گوئی کے عام انداز کا واضح پتہ چلتا ہے۔ یہ عام انداز بیشتر معنوی اور لطیف تعمیہ (تدخلہ و تخرجہ) تک محدود ہے اور اس پر مستزاد ہیں سالم الاعداد مادے۔ جلیل مانکپوری سے لے کر مغیث الدین فریدی تک تاریخ گوئی عموماً ان ہی خطوط پر گامزن ہے۔ درمیان میں ایسے تاریخی قطعات بلاشبہ مل جاتے ہیں جن میں

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۹) جس میں ایک لڑکی کی ولادت کو باعثِ برکات لامحدود قرار دیا ہے اور جو پیچیدگی سے مبرا ہے:

اس مسعودِ جلیل القدر کو — جو کہ اصل و نسل میں محدود ہے
یادگارِ سید والا گہر — نورِ چشم سید محمود ہے
راحت جان و جگر دختر نئی — شکرِ خالق، منتِ معبود ہے
خانداں میں اک لڑکی کا وجود — باعثِ برکاتِ لامحدود ہے

کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
باسعادت دخترِ مسعود ہے ۱۹۴۳ء (ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد، مارچ، اپریل ۱۹۹۳ء ص ۲۱)

دونوں قطعات میں جو نمایاں فرق ہے اس کا قارئین خود اندازہ فرمائیں گے۔

صنعتِ زبر و بینہ کے علاوہ صنعتِ ترصیع و توشیح سے کام لیا گیا ہے، مگر اصلاً بیسویں صدی میں صنائع سے عاری تاریخیں کہنے کا رجحان زیادہ رہا ہے اور ایسا صرف اس لئے ہے کہ علم بلاغت اور حسابِ جمل کے رموز و نکات سے واقفیت اتنی عام نہیں جتنی کہ پہلے تھی، پھر قاری بھی ان علوم سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے قبل اور اس کے بعد شعراء کے جس قدر مجموعے (دواوین) منظرِ عام پر آئے ہیں ان میں سے زیادہ تر روایتی انداز کے دواوین سے مختلف ہیں بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ عہدِ حاضر کے مجموعہ ہائے کلام تاریخی قطعات سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں "عندلیب تواریخ"، "گلزار" اور "انیس سو بیاسی" جیسے مجموعوں کو مستثنیات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مجموعوں کی شکل میں نہ سہی اخبارات و رسائل کے صفحات پر قطعاتِ تاریخ کا چلن ابھی عام ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر باب میں مختلف واقعات و حادثات سے متعلق جس قدر مادہ ہائے تاریخ کی مثالیں درج کی گئیں ان کی روشنی میں نہ صرف موجودہ دور کی تاریخ گوئی کے انداز و اسلوب کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس فن سے اہلِ علم کی دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

شعر الہند (حصہ اول و دوم)

از مولانا عبدالسلام ندوی

حصہ اول: اس میں اردو کے شعرائے قدیم کے دور سے لے کر شعرائے جدید کے دور تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ کیا گیا ہے۔

قیمت ۹۳ روپے

حصہ دوم: جس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی اور ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔

قیمت ۶۵ روپے

علامہ شبلی کی تصنیفات کے ترجمے

از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی*

علامہ شبلی کی شخصیت جامع کمالات تھی، انہوں نے مدۃ العمر علم و فن کی جو گراں قدر اور عظیم الشان خدمت انجام دی اس کا آج بھی سارا زمانہ معترف ہے ع

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

علامہ شبلی نے بقول مولانا سید سلیمان ندوی "بتیس ۳۲ برس (۱۸۸۲ء-۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پُرشور رکھا"[1]

اس بتیس ۳۲ برس کی مدت میں انہوں نے ایسی معرکۃ الآرا کتابیں اور گراں مایہ مقالات سپرد قلم کئے جن کی عظمت و بلند پایگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کتابوں کے سینکڑوں ایڈیشن طبع ہوئے اور وہ نہایت مقبول ہوئیں بلکہ متعدد کتابوں کے ترجمے بھی دنیا کی مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، انگریزی، ترکی، پشتو اور ملیالم وغیرہ میں ہو چکے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق تو ادا کیا ہی اس کے علاوہ تعبیر و بیان کا ایسا انوکھا اور اچھوتا پیرایہ اختیار کیا کہ تعلیم یافتہ طبقہ اس سے متاثر

۱؎ مولانا سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی ص ۱، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء۔

* ادب کدہ، مہراج پور، انور گنج۔ اعظم گڑھ۔

ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کے ذریعہ علامہ شبلی کا فیض ابھی تک جاری ہے اور ان کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کا یہ بیان سراسر غلط ثابت ہوا کہ:

" مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے، زمانہ کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکا وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ میں ہے، ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی"[1]

یقیناً زمانہ کے دست و برد سے کوئی نہیں بچ سکا اور بقائے دوام کا دعویٰ کس کو زیب دیتا ہے، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ علامہ شبلی کی تصانیف پر پون صدی سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد بھی شب و روز کی گردشوں سے پھپھوندیں نہیں لگیں اور دنیائے علوم و فنون میں نئے نئے انقلابات رونما ہونے کے باوجود ان کی کتابوں کے سینکڑوں ایڈیشن طبع ہو کر حسن قبول کی سند حاصل کرتے جا رہے ہیں اور ان سے استفادے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، ان کی کتابیں کتب خانوں کے ساتھ لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے ماہرین اور اہل علم کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں اور غیر زبانوں میں علامہ شبلی کی تصانیف کے تراجم ہو رہے ہیں۔ اس مقالہ میں ان تراجم کا ایک مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ تصانیف شبلی کی مقبولیت اور عظمت و بلند پایگی کا اندازہ ہو سکے۔

۱۔ تاریخ بدر الاسلام

علامہ شبلی کے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں ان کے قلم سے جو تحریر سب سے پہلے نکلی وہ تاریخ بدر الاسلام تھی، عربی زبان میں یہ کتاب درسی ضروریات کے پیش نظر سر سید احمد خاں کی فرمایش پر لکھی گئی تھی،[2] یہ کتاب اس وقت کے ایم، اے، او

۱؎ مولوی عبدالحق۔ مقدمہ خطوط شبلی ص ۲۶ ۲؎ مقالات یوم شبلی ص ۱۱۱۔

کالج کے نصاب میں شامل رہی، اردو و فارسی میں اس کے کئی ترجمے ہوئے۔

۱۔ اس کا پہلا فارسی ترجمہ سرسید احمد خاں کی فرمایش پر علامہ شبلی کے شاگرد اور ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی نے کیا تھا[1] جو مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۳۰۳ھ (۸۶-۱۸۸۵ء) میں شایع ہوا۔ اس کا ایک ایڈیشن تجارتی پریس علی گڑھ نے بھی شایع کیا۔

۲۔ اس کا اردو ترجمہ میمونہ سلطان شاہ بانو (بیگم نواب حمید اللہ خاں بھوپال) نے آغاز اسلام کے نام سے کیا، یہ اصل عربی کتاب کے بجائے مولانا فراہی کے فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۱۵ء میں مطبع سلطانی ریاست بھوپال سے شایع ہوا۔ اس کا نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

آغاز اسلام کے دو ایڈیشن دہلی سے بھی شایع ہوئے، ایک مہتاب پریس دہلی سے شایع ہوا جب کہ دوسرا ایڈیشن رنگین پریس دہلی نے ۱۳۴۳ھ میں شایع کیا۔

۳۔ بدء الاسلام کا ایک اور اردو ترجمہ حیات النبی کے نام سے شایع ہوا ہے مگر اس پر مترجم کا نام درج نہیں اسے تاج کمپنی لاہور نے شایع کیا تھا۔

۲۔ سیرۃ النعمان علامہ شبلی کو امام ابو حنیفہ کی ذات سے بڑی عقیدت و محبت تھی، جس کی بنا پر ان کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی نے انہیں نعمانی کی نسبت دی[2]، جو ان کے نام کا جزو لاینفک ہوگئی۔ امام اعظم سے عقیدت و شیفتگی کا ایک مظہر یہ تصنیف بھی ہے جو دراصل ان کے سلسلہ ناموران اسلام کی ایک کڑی ہے۔ یہ ۱۸۹۰ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۹۱ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ کی طرف سے پہلی بار شایع ہوئی، ایک صدی کا عرصہ گزر گیا، اس وقت سے اب تک مسلسل طبع ہو رہی ہے اور انگریزی میں بھی منتقل ہو چکی ہے[3]، اسے

[1] مولانا عبد الرحمن ناصر اصلاحی۔ مختصر حیات حمید ص ۶ [2] حیات شبلی ص ۷۹۔

انگریزی قالب جناب ہادی حسین نے عطا کیا ہے، جسے ۱۹۷۸ء میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور نے شایع کیا۔

۳۔ الفاروق یہ علامہ شبلی کی نہایت معرکۃ الآرا اور اردو زبان کی مقبول ترین کتاب ہے، علامہ شبلی نے اس کی تصنیف و تالیف کے لئے ممالک اسلامیہ کا سفر کیا اور وہاں کے متعدد کتب خانوں کی نادر و کمیاب کتابوں سے استفادے کے بعد اس کی تالیف کی، خود علامہ شبلی کو اپنی تمام تصنیفات میں الفاروق سب سے زیادہ پسند تھی[1]۔ الفاروق جنوری ۱۸۹۹ء میں مطبع نامی کانپور سے پہلی بار طبع ہوئی۔ اس وقت سے آج تک برابر طبع ہو کر اہل علم کی تشنگی بجھا رہی ہے۔

علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ اس کا عربی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ عربی داں طبقہ کے لئے اس سے استفادہ آسان ہو گو ان کی یہ خواہش اب تک پوری نہ ہو سکی لیکن دنیا کی کئی اور زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے اور مقبول ہوئے، جس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ اس کا انگریزی ترجمہ شیخ عطاء اللہ نے شروع کیا تھا مگر وہ اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے[2]، مگر بعد میں یہ کام علامہ شبلی کے شاگرد مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے بحسن و خوبی انجام دیا جسے شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ لاہور نے ۱۹۵۶ء میں شایع کیا، اس کے اب تک چار ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور پانچواں ایڈیشن عماد پبلی کیشن دہلی نے شایع کیا۔

۲۔ الفاروق کا دوسرا انگریزی ترجمہ جناب محمد سلیم کے قلم سے ہے، یہ ترجمہ بھی شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ لاہور ہی نے ۱۹۵۷ء میں شایع کیا، پھر ۱۹۶۲ء میں وہیں سے دوسرا

[1] مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۳۵۔ علامہ شبلی کا یہ قول سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے کا ہے [2] البصیر شبلی نمبر ص ۶، [3] ایضاً۔

ایڈیشن بھی طبع ہوا۔

۳۔ علامہ شبلی کی تصانیف کے قدرداں اور مرتبہ شناس امرا و رؤسا اور فرمانروایانِ ریاست بھی تھے، الفاروق کی تالیف و تکمیل میں سرکار آصفیہ حیدر آباد کا اشتراک شامل تھا اور وہ سلسلہ آصفیہ میں داخل تھی، اسی طرح سیرۃ النبی کی تالیف میں بیگم بھوپال کی دلچسپی و توجہ سے اہلِ نظر بخوبی واقف ہیں، علامہ شبلی کا یہ قطعہ بیگم صاحبہ کی علم نوازی و معارف پروری کو زندۂ جاوید کر گیا۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں بہرصورت — کہ ابرِ فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی — تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

اوپر گزر چکا ہے کہ تاریخ بدء الاسلام کے ترجمہ کی سعادت نواب حمید اللہ خاں بھوپال کی بیگم میمونہ سلطان شاہ بانو کے حصہ میں آئی، اسی طرح الفاروق کے فارسی ترجمہ کی سعادت محمد نادر شاہ بادشاہ افغانستان کی ہمشیرہ عزت مآب علیا کا مقدر بنی، اس کی تصحیح و ترتیب کا کام جناب نجف علی عاصی جلال پوری نے انجام دیا جسے قندھار سے حاجی عبدالستار نے شایع کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن مسلم پرنٹنگ پریس لاہور نے شایع کیا۔ یہ کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے۔

۴۔ الفاروق کا پشتو زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے جو غلام قادر کے قلم سے ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۴۹ء میں کراچی سے شایع ہو چکا ہے۔

۵۔ ترکوں سے علامہ شبلی کو خاص محبت تھی، محمد عمر رضا کحالہ نے الفاروق کا ترکی میں

ترجمہ کرکے اس محبت کا حق ادا کیا ہے، اسے آمدی مطبع سی۔ استانبول نے "حضرت عمرؓ" کے نام سے شایع کیا ہے۔

الفاروق دو حصوں پر مشتمل ہے اردو میں یہ دونوں حصے ایک ساتھ طبع ہوتے ہیں مگر ترکی میں عمر رضا کحالہ نے دونوں حصے الگ الگ شایع کیے۔ پہلا حصہ ۱۹۲۱ء میں اور دوسرا حصہ ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا، یہ دونوں مطبوعہ نسخے دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

۶۔ الفاروق کا ایک ترجمہ مالاباری (ملیالم) زبان میں بھی ہوا ہے، یہ ترجمہ جناب عبدالسلام کے قلم سے ہے، اسے اسلامیہ پبلشنگ ہاؤس وکم۔ ٹراونکور نے وی۔ وی پریس ترویندرم سے طبع کرا کے ۱۹۳۰ء میں شایع کیا، یہ مطبوعہ نسخہ بھی دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

ان ترجموں سے الفاروق کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، عربی اور ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی میں بھی اگر اس کے ترجمے ہو جاتے تو بہت بہتر ہوتا۔

سلسلۂ کلامیہ علامہ شبلی نے اپنے قیام حیدر آباد کے زمانہ میں سلسلۂ کلامیہ کی تصنیفات کا آغاز کیا جس میں الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم اور الغزالی جیسی معرکۃ الآرا کتابیں شامل ہیں، اہلِ فارس نے ان کتابوں سے دلچسپی لی اور اس سلسلہ کی دو کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۔ علم الکلام اس کتاب کا تاریخ علم الکلام کے نام سے جناب سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے فارسی میں ترجمہ کیا جو ۱۳۲۸ھ ش میں تہران سے شایع ہوا، ۱۳۳۰ھ ش میں تہران۔ ایران ہی سے اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شایع ہوا۔

۵۔ سوانح مولانا روم اس کتاب کو بھی جناب سید محمد تقی فخر داعی گیلانی ہی نے فارسی میں منتقل کیا جو ۱۳۳۲ھ ش میں شرکت چاپ رنگین تہران۔ ایران سے شایع ہوا۔

۶۔ شعر العجم شعر العجم اپنے موضوع پر ایک مایہ ناز اور شاہکار تصنیف ہے، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک و بیرونِ ملک سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

ہسٹری آف پرشین لٹریچر کے مشہور مصنف پروفیسر براؤن (E.G. BROWNE) اس کی خوبیوں کے معترف و مداح تھے، انھوں نے اپنی کتاب میں اس سے جابجا استفادہ بھی کیا، ان کی تمنا تھی کہ کاش شعر العجم فارسی اور انگریزی میں ترجمہ ہو جاتی، ان کی یہ تمنا پوری ہوئی اور اس کی تمام جلدوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور ایران اور افغانستان دونوں جگہوں سے شایع ہوا۔

شعر العجم کی پانچوں جلدوں کے ترجمہ کی سعادت سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے حاصل کی جو ۱۳۱۶ھ ش۔ ۱۳۲۷ھ ش، ۱۳۱۴ھ ش۔ ۱۳۱۴ھ ش میں کتب خانہ ابن سینا تہران سے شایع ہوئے۔ یہ ترجمے کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہیں۔

شعر العجم کی چند جلدوں کا تہران سے دوسرا ایڈیشن بھی چھپا مثلاً جلد اول ۱۳۱۶ھ ش کے بعد دوبارہ ۱۳۳۵ھ ش میں شایع ہوئی، اسی طرح جلد سوم کا ترجمہ ۱۳۱۴ھ ش کے بعد ۱۳۳۶ھ ش میں اور جلد چہارم کا ۱۳۱۴ھ ش کے بعد ۱۳۳۶ھ ش میں دوبارہ شایع ہوا۔

کابل میں منصور انصاری نے شعر العجم کی تین جلدوں کو فارسی میں منتقل کیا۔ چنانچہ جلد اول۔ دوم اور پنجم کے ترجمے کابل سے علی الترتیب ۱۳۰۶ھ ش۔ ۱۳۰۶ھ ش۔ ۱۳۰۴ھ ش میں شایع ہوئے۔

ان کے علاوہ چند دوسرے اہلِ علم نے بھی شعر العجم کی بعض جلدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا، مثلاً افغانستان کے مشہور شاعر سرور خاں گویا نے جلد سوم کو فارسی کا جامہ پہنایا جسے انجمن ادبی کابل نے ۱۳۱۵ھ میں شایع کیا۔

اسی طرح برہان الدین کشکگی نے جلد چہارم کو فارسی قالب دیا جو ۱۳۰۶ھ میں لاہور سے شایع ہوا۔

۷۔ سیرۃ النبی یہ علامہ شبلی کی سب سے زیادہ مہتم بالشان اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے جسے وہ اپنی زندگی کا حاصل اور وسیلۂ نجات خیال کرتے تھے[1]، اس میں شبہ نہیں کہ سیرۃ النبی کتبِ سیرت کے پورے ذخیرہ میں ایک بہت ممتاز تصنیف ہے، اس نوعیت کی جامع سیرت کسی زبان میں حتیٰ کہ عربی زبان میں بھی نہیں لکھی گئی[2]۔ اس کی تصنیف پر پون صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے تاہم ابھی تک اس کی شہرت و مقبولیت اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اس کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں اور کئی زبانوں مثلاً عربی، انگریزی، ترکی اور پشتو وغیرہ میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ سیرۃ النبی کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو سکے[3]، چنانچہ سیرۃ النبی کی طباعت و اشاعت کے آغاز ہی سے اہلِ علم اور اربابِ ذوق نے اس کے انگریزی ترجمہ کی کوششیں شروع کر دیں، سب سے پہلے علامہ شبلی کے شاگرد مولانا محمد علی جوہر نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا اور مولانا سید سلیمان ندوی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ سیرۃ النبی کی جو کاپیاں چھپتی جائیں وہ ان کے پاس بھیجتے جائیں تاکہ طباعت

---

[1] مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۰۱ [2] مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔ حضرۃ الاستاذ کے دینی و علمی خدمات معارف سلیمان نمبر ص ۱۷۸ [3] مقالاتِ شبلی ج ۸ ص ۳۶

کے ساتھ ترجمہ بھی ہوتا جائے [1] سید صاحب نے غالباً اس کا اہتمام بھی کیا، مگر مولانا جوہر اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے یہ کام انجام نہیں دے سکے، ان کے علاوہ بھی متعدد اہل علم نے انگریزی ترجمہ کی اجازت چاہی جسے سید صاحب نے بخوشی منظور بھی کر لیا، خود سید صاحب لکھتے ہیں:

"سیرت کے انگریزی ترجمہ کا خیال بھی مدتوں سے ہے اور کئی صاحبوں نے اس کی اجازت مانگی اور دی گئی مگر پورا کسی نے نہیں کیا، اسی اثنا میں خود اپنے یہاں اس کام کو شروع کیا گیا مگر کچھ ایسے اسباب ہوئے کہ یہ کام رک گیا، اب لاہور کے ایک ممتاز صاحب دل اور صاحب قلم خواجہ عبدالوحید سکریٹری اسلامک ریسرچ سوسائٹی نے ہمت کی اور اس کے دیباچہ کا انگریزی ترجمہ خدام الدین کے انگریزی پرچے "اسلام" میں شایع کیا اور اب وہ ہمت کر رہے ہیں کہ پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کریں۔ خدا کرے یہ کام بھی تکمیل کو پہنچے" [2]

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

"پاکستان میں کئی اصحاب نے سیرت کے انگریزی ترجمہ کی اجازت چاہی جو دیدی گئی، ایک وکیل صاحب نے جن کا نام یاد نہیں رہ گیا ایک انگریز کی مدد سے پہلی جلد کا ترجمہ شروع بھی کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں انہوں نے خط و کتابت بھی کی لیکن پھر اس کا انجام نہیں معلوم ہوا" [3]

۱- انگریزی ترجمہ کی یہ کوششیں اگرچہ بارآور ثابت نہ ہو سکیں تاہم بعد میں یہ سعادت جناب فضل الرحمن صاحب نے حاصل کی، انہوں نے سیرۃ النبی کو انگریزی قالب عطا کیا،

---

[1] مشاہیر کے خطوط ص ۵۰ و ۶۲ [2] ماہنامہ معارف فروری ۱۹۴۰ء [3] حیات سلیمان حاشیہ ص ۴۷۵۔

جسے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے علی الترتیب ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء میں شایع کیا۔

۲- سیرۃ النبی کا دوسرا انگریزی ترجمہ طیب بخش بدایونی نے کیا جو قاضی پبلشرز لاہور سے ۱۹۷۹ - ۱۹۸۰ء میں شایع ہوا، اس ترجمہ کو دہلی کے ادارۂ ادبیات دلی نے بھی ۱۹۷۹ء میں شایع کیا، ۱۹۸۳ء میں یہیں سے اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شایع ہوا۔ یہ ترجمے کتب خانۂ دارالمصنفین میں موجود ہیں۔

۳- انگریزی کی طرح پشتو زبان میں بھی سیرۃ النبی کے کئی ترجمے ہوئے۔ برہان الدین کشکی نے ابتدائی دونوں جلدوں کا ترجمہ کیا جو پشتو تولنہ کابل سے علی الترتیب ۱۳۲۶ھ اور ۱۳۲۸ھ میں شایع ہوئے اور دارالمصنفین میں موجود ہیں۔

۴- پہلی اور دوسری جلد کو جناب عزیز الرحمن سیفی نے بھی پشتو میں منتقل کیا، پشتو تولنہ کابل ہی سے ۱۳۵۰ھ اور ۱۳۵۴ھ میں یہ دونوں حصے شایع ہوئے۔ کتب خانہ دارالمصنفین میں اس کے نسخے موجود ہیں۔

۵- جلد اول کا ایک اور پشتو ترجمہ محمد اسرائیل کے قلم سے ہے، اسے پشتو اکیڈمی پشاور نے ۱۹۶۹ء میں شایع کیا۔

۶- سیرۃ النبی کو ملیالم زبان میں بھی منتقل ہونے کا شرف حاصل ہے، اسے جناب بی۔ داؤد شاہ (بی۔ اے) اور حافظ محمد یوسف فاضل باقوی نے ملیالم زبان کا لباس عطا کیا، یہ ترجمہ کتب خانہ دارالاسلام مدراس نے گارڈن پریس سے طبع کرا کے ۱۹۳۲ء میں شایع کیا۔ یہ نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے۔

۷- سیرۃ النبی کے عربی ترجمہ کی متعدد کوششیں کی گئیں، خود مولانا سید سلیمان ندوی کی بھی آرزو تھی کہ سیرۃ النبی کو عربی میں منتقل کیا جائے، اس کے لئے وہ مصر کے سفر کا ارادہ

بھی رکھتے تھے تاکہ وہاں کچھ دنوں رہ کر طباعت و اشاعت کی نگرانی کر سکیں[۱]، مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔

اسی زمانہ میں متعدد اہلِ علم نے عربی ترجمہ کی طرف نہ صرف توجہ دلائی بلکہ متعدد اصحابِ علم و فن نے ترجمہ کرنے کے لئے اجازت بھی مانگی، مصر یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر عبدالوہاب عزام نے جو اردو و فارسی کے استاذ تھے، سیرۃ النبی کے اردو ترجمہ کی اجازت چاہی جسے سید صاحب نے بخوشی منظور کر لیا، عبدالوہاب عزام نے سید صاحب کو جو خط لکھا تھا اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں نے آپ کی سیرۃ نبویہ کا ترکی ترجمہ پڑھا تو اس کو میں نے اس لائق پایا کہ خود قرآن کی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے، اس لئے میں نے اور چند ہندوستانی بھائیوں نے ارادہ کیا ہے کہ ہم عربی میں اس کا ترجمہ کریں۔"[۲]

یہ اطلاع سید صاحب کے لئے کسی بڑی خوشی سے کم نہ تھی، چنانچہ انہوں نے قارئین معارف کو بھی دسمبر ۱۹۳۳ء کے شذرات کے ذریعہ یہ خوش خبری سُنائی کہ مصر کے چند ادبا نے عربی ترجمہ کے لئے آمادگی ظاہر کی ہے[۳] مگر پھر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ترجمہ کا کام ہوا کہ نہیں، بعد میں مصر سے اس کام کی اجازت ندوۃ العلماء کے ایک فاضل مولانا محمد اسماعیل ندوی مدراسی نے مانگی جسے اربابِ دارالمصنفین نے بخوشی منظوری دے دی، کچھ دنوں تک انہوں نے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رکھا[۴]، اس کے بعد مولانا مدراسی مصر سے الجزائر منتقل ہو گئے،

[۱] عبدالعزیز میمنی۔ ابو العلا ما لہ و ما الیہ، مقدمہ ص ۵ مطبعۃ السلفیہ قاہرہ ۱۳۴۴ھ [۲] بحوالہ حیات سلیمان، ص ۴۰، ۴۴ [۳] شذرات سلیمانی، ج ۳ ص ۲۸، مطبوعہ دارالمصنفین ۱۹۹۸ء [۴] حیات سلیمان، ص ۴۰، ۴۰۔

اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ ان کے علمی متروکات جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے حصے میں آئے جس میں سیرۃ النبی جلد اول کا عربی ترجمہ بھی تھا، مولانا ڈاکٹر اجمل ایوب اصلاحی صاحب نے اس کا عکس حاصل کیا اور دارالمصنفین کے اس وقت کے ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کے حوالہ کیا، انہوں نے اسے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی خدمت میں پیش کیا تاکہ وہ اپنے اثر و رسوخ اور وسائل و ذرائع سے اسے جلد از جلد شائع کرا دیں۔ حسنِ اتفاق سے اسی زمانہ میں رابطہ ادب اسلامی کا ایک سمینار لکھنؤ میں ہوا جس میں .... شرکت کے لئے قطر کے وزیر اوقاف جناب عبداللہ ابراہیم انصاری لکھنؤ تشریف لائے تھے انہوں نے سیرۃ النبی کے ترجمہ پر اپنی مسرت ظاہر کرتے ہوئے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ اس کی دوسری جلدوں کو عربی میں منتقل کر دیا جائے، اخراجات کی ذمہ داری خود انہوں نے اپنے سر لے لی مگر پھر بھی وہ شایع نہ ہو سکا اور جناب عبداللہ ابراہیم انصاری صاحب اس دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔ مولانا مدراسی کا ترجمہ گذشتہ چودہ سالوں سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اور ان کے رفقائے کار مولانا عبداللہ عباس ندوی اور مولانا سید محمد رابع ندوی کے پاس ہے اور اب بھی منتظرِ اشاعت ہے

۸۔ اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر

۱۹۰۶ء میں علامہ شبلی نے مولانا محمد علی جوہر کے اصرار پر بڑودہ کا سفر کیا وہاں مولانا جوہر نے درخواست کی کہ عالمگیر پر عائد الزامات و اتہامات کے رد و ابطال پر ایک مفصل مضمون تحریر فرمائیں[۱]۔ چنانچہ سفر سے واپسی کے بعد علامہ شبلی نے عالمگیر پر مسلسل مضامین لکھنا شروع کیا۔ علامہ شبلی اس زمانہ میں ماہنامہ الندوہ کے مدیر تھے، یہ سلسلہ مضامین اسی میں شایع ہو کر مقبول ہوا، ۱۹۰۹ء میں کتابی صورت میں

[۱] محمد سرور۔ خطوط محمد علی ص ۵۹ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۴۳ء۔

طبع ہوا، اب تک اس کے متعدد ایڈیشن مختلف ناشروں نے شایع کئے ہیں، اس کی اہمیت کے پیشِ نظر مولانا محمد علی جوہر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے[1] مگر وہ یہ کام اخیر تک نہ کرسکے، اس زمانہ میں اس کام کی سعادت ڈاکٹر سید محمود نے پائی، علامہ شبلی کی اجازت سے انہوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ یا خلاصہ لندن میں شایع کیا[2]۔

۱۹۸۱ء میں دار المصنفین کے سابق ناظم جناب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم نے اسے انگریزی میں منتقل کیا جو عالمگیر کے نام سے ادارہ ادبیات دلی سے ۱۹۸۱ء میں شایع ہوا اور دستیاب ہے۔

علامہ شبلی کی تصانیف ہی کی طرح ان کے گراں مایہ مقالات بھی بہت مقبول ہوئے اور چند مقالات کا ترجمہ بھی ہوا۔

الجزیہ یہ علامہ شبلی کا مشہور تحقیقی مقالہ ہے جس کو انہوں نے ۱۸۸۹ء میں لکھا تھا، یہ مطبع مجتبائی لاہور سے ۱۸۹۱ء میں شایع ہوا اولاً خود علامہ شبلی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا جو مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں شایع ہوا، سرسید احمد خاں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا تھا[3]۔ باوجود تلاشِ بسیار کے وہ دستیاب نہ ہوسکا اور نہ یہ معلوم ہوسکا کہ ترجمہ کس کا تھا اور کہاں سے شایع ہوا۔ ایک ترجمہ انگریزی میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمن نے کیا تھا جو غالباً اسلامک کلچر حیدر آباد میں شایع ہوا۔

۲۔ کتب خانہ اسکندریہ یورپ نے اس الزام کو بڑی شہرت دی کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مسلمانوں نے مصر و اسکندریہ کو فتح کیا تو انہوں نے وہاں کے قدیم یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے قائم تھا جلا کر خاک کردیا، اس بے سروپا الزام کے جواب میں علامہ شبلی

[1] محمد سرور خطوط محمد علی ص ۹۰ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۴۰ء [2] حیات شبلی ص ۳۴۵ [3] ایضاً ص ۲۲۷۔

نے بہ دلائل ثابت کیا کہ مسلمانوں پر یہ الزام سراسر غلط ہے اور فتح اسکندریہ سے پہلے ہی اس کتب خانہ کو خود عیسائیوں نے تباہ و برباد کردیا تھا اور اس کی بربادی میں عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی پیشوا بھی شریک تھے۔

علامہ شبلی کا یہ محققانہ مقالہ بھی بہت مقبول ہوا اور متعدد بار کتابی صورت میں طبع ہوا، مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "اس مضمون کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا"[1]۔

اس مضمون کو انگریزی کا جامہ جناب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم نے پہنایا، یہ ترجمہ کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہے مگر اس سے سنہ طباعت اور ناشر کا پتہ نہیں چلتا۔

اس محققانہ مضمون کو فارسی میں بھی منتقل کیا گیا۔ جناب سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے یہ کام انجام دیا جو تہران سے ۱۳۱۵ھ ش میں شایع ہوا۔

۳۔ الانتقاد علی التمدن الاسلامی علامہ شبلی نے مشہور مورخ جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کا مفصل تنقیدی جائزہ لے کر اس کی غلط بیانیوں کی نشاندہی کی، علامہ شبلی کی اس عربی تحریر کے بعض اجزا اولاً علامہ رشید رضا نے اپنے رسالہ المنار مصر میں شایع کئے اور پھر مصر ہی سے یہ کتابی صورت میں ۱۹۱۲ء میں شایع ہوئی، اردو زبان میں خود علامہ شبلی نے اس کا خلاصہ کیا، جو مقالات شبلی جلد چہارم میں شامل ہے۔

۴۔ جہانگیر علامہ شبلی نے جہانگیر و تزک جہانگیری کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا ہے جو مقالات شبلی جلد چہارم میں شامل ہے اس تاریخی مضمون کو بھی جناب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم نے انگریزی میں منتقل کیا[2]۔

تصانیف شبلی کے تراجم کے اس مختصر سے جائزے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات کی مقبولیت کا دائرہ کتنا وسیع تھا اور اس کے کس قدر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے[3]۔

[1] حیات شبلی ص ۲۲۶ [2] نیا دور لکھنؤ یادرفتگاں نمبر ص ۱۴۱ [3] اس مضمون کی تیاری میں کتاب نامہ شبلی مرتبہ جناب اختر راہی اور اشاریہ جہان شبلی مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری صاحب شمولہ فکر و نظر شبلی نمبر علی گڑھ سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

باب التقریظ والانتقاد

آواز کا لمس

از ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی*

مرتبہ جناب قمر سنبھلی، تقطیع اوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر مع خوبصورت گردپوش، صفحات ۱۱۲، قیمت ۷۰ روپے پتے: (۱) قمر سنبھلی ۲۰۰۵ نئی سڑک دہلی ۱۱۰۰۰۶ (۲) رہبر کارنر ۲۹۳، کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

"آواز کا لمس" جناب قمر سنبھلی کے اشعار کا مجموعہ ہے۔ وہ بہت حساس قسم کے شریف النفس انسان ہیں۔ ان کی حساسیت اور شرافت دونوں ان کے اشعار سے نمایاں ہیں۔ جناب قمر سنبھلی کی شاعری کا میں اس لئے دلدادہ ہوں کہ ان کے یہاں مقصدیت کی سنجیدگی ہے، وہ الفاظ کے گھروندے اور قافیوں کے تاج محل نہیں بناتے بلکہ تندرست، جاندار اور تعمیری ادب کے ذریعہ ہماری مایوسیوں کو دور کر رہے ہیں۔

ابن قدامہ نے "نقد الشعر" میں بڑے نکتہ کی بات لکھی ہے کہ شاعر کی تصویر اگر شعر میں نمایاں نہ ہو اور اس کے عصر کی ترجمانی نہ ہو تو آپ اس کو صاحب فن، نقال (ایکٹر) اور فنِ عروض و قافیہ کا واقف کار تو کہہ سکتے ہیں، مگر شاعر نہیں کہہ سکتے۔ قمر سنبھلی صاحب کے اشعار میں عصر حاضر کی بے چینی اضطراب، سوسائٹی کا اخلاقی انحطاط لطیف طنز کی شکل میں نمایاں ہے۔ خالق سے منھ موڑنے اور اس کے احکام سے انحراف نے انسانی مزاج میں زہر گھول دیا ہے۔ ادب و شعر کے قالب میں فکر و عمل کا تضاد جس طرح اس دور میں کھل کر سامنے آیا ہے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ قمر سنبھلی صاحب کی غزلوں میں ان اقدار پر خاطر خواہ طنز ہے مگر زبان غزل کی ہے، لہجے میں تیزی اور مٹھاس ہے

* سابق پروفیسر جامعہ ام القری، معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

ان کا کلام ابہام، رمزیت اور اخلاقی بے باکیوں سے پاک ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ نئے قافیئے تراشنے اور اچھوتی ترکیب سے روشناس کرانے میں کسی معاصر سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہ شعر دیکھیں:

گھر نہ کر لیں قمر کہیں آسیب　　اک دیا تم مکان میں رکھنا

باقی نہیں تاثیر دعاؤں میں مری کیوں؟　　در کو ترے چھو کر مرے لب کیوں نہیں آتے

کرتے ہیں بہت ذکر وہ پندار و انا کا!　　اس زمرہ میں خود اہل ادب کیوں نہیں آتے

لطافت اس کے سخن کی بسا کے لہجے میں　　سدا بہار غزل کے کنول بناتا ہوں

زیاں لہو کا مرے ایسا کچھ زیاں بھی نہیں　　ہر ایک بوند سے طوفان کوئی نکلے گا

کہیں نہیں ہے قمر! پھر بھی ہر جگہ موجود!　　وہ بے نشان کہ ہر شے میں ہے نشان اس کا

مشغلہ اچھا ہے یہ بھی یہ تماشا کیجئے!　　سر تو نہی نیزوں سے نیزوں پر اچھالا کیجئے

دیکھئے ایسا نہ ہو ہاتھوں سے سمتیں چھوٹ جائیں　　آندھیوں میں بادبانوں کو نہ کھولا کیجئے

جن میں شامل تھی نمی اپنے پسینے کی قمر
دانے گندم کے وہ مٹھی بھر ہمیں اچھے لگے

یہ اشعار کثرت سے پڑھے جائیں گے۔ بعض شعر تو ضرب المثل بن جائیں تو تعجب نہیں جیسے یہی آخری شعر۔ "آواز کا لمس" حسین اور اچھوتا نام ہے۔ اس میں معنوی گہرائی بھی ہے۔ ایک حاسہ کا کام دوسرے حواس سے لینا اعلیٰ ترین قدرت بیانیہ کا مظہر ہے، قرآن کریم میں ہے "ذوقوا مس سقر" (جہنم کے چھونے کو چکھو)، سب سے اعلیٰ سند ہے۔

پیشِ نظر مجموعۂ شعری کے ٹائٹل پر "آواز" پہلی سطر میں ہے "کا لمس" دوسری سطر میں۔ اس لئے "کالمس" ایک لفظ معلوم ہوتا ہے، اس کو اس طرح لکھا جانا چاہئے تھا کہ 'لمس' نمایاں ہوتا۔

مطبوعات جدیدہ

ربا کیا ہے از جناب اقبال احمد خاں سہیل مرحوم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۳۰، قیمت درج نہیں، پتہ: فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیوٹ لیمیٹڈ، پوسٹ بکس نمبر ۹۷۰۱، ڈی۔۸۴ ابوالفضل انکلیو۔ اجامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵-

مولانا اقبال احمد سہیل مرحوم کی شہرت قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر کی ہے، وہ ایک ممتاز وکیل بھی تھے۔ لیکن جدید تعلیم کے حصول سے پہلے انہوں نے علوم دینیہ کی تحصیل مکمل کرلی تھی، علامہ شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ سے تلمذ کا شرف حاصل تھا، مذہبی علوم پر ان کی نظر تھی، لیکن فکرِ سخن اور مشغلۂ وکالت نے علمی و مذہبی موضوعات پر ان کو قلم فرسائی کی فرصت نہیں دی، ۱۹۳۰ء کے عشرہ کے انگریزی ہندوستان میں سود اور اس کے متعلقات پر ایک بحث شروع ہوئی تو بعض اہلِ علم کے اصرار پر انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار زیرِ نظر کتاب کی شکل میں کیا تھا جس سے ان کی دقتِ نظر اور صلاحیت غور و فکر کا اندازہ ہوتا ہے، عرصے سے یہ کتاب نایاب تھی، ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہندوستان کے مخصوص حالات اور پیش آمدہ جدید اقتصادی مسائل کے باب میں اس کا مطالعہ اب بھی فکر انگیز اور مفید مطلب ہے، "تفاضل فی الجنس" ربا الفضل اور ربا النسیہ کے متعلق آیات و احادیث و آثار کی روشنی میں مصنف مرحوم نے اپنا موقف واضح کر دیا کہ سود اور ربو اہم معنی نہیں، مراطلت و بیع صرف کے احکام کو ربا سے مخلوط کر دیا گیا ہے، اور موجودہ سودی کاروبار اور فقہی ربا باہم

بالکل مختلف ہیں، آیات ربا میں جو ربا حرام ہے وہ بیع سلف سے متعلق ہے، دار الحرب میں غیر مسلموں سے سودی معاملت اور سرکاری بینک وغیرہ کا سود جائز ہے، مصنف مرحوم کے افکار و نتائج سے فقہاء کا کلیتہً اتفاق ممکن نہیں، تاہم موجودہ عالمی نظام معیشت اور علم الاقتصاد کی سیاسی اہمیت کے پس منظر میں مسئلہ ربوا یقیناً نہایت غور و فکر اور مجتہدانہ بصیرت کا متقاضی ہے، مسلکی بنیاد پر روایتی تشریحات پر اکتفا کرنا اس نازک اور نہایت اہم مسئلے سے انصاف نہیں، کتاب کے طبع جدید کی غرض بھی یہی ہے کہ "اس مدلل و مفصل بحث کو علماء اور خواص امت کے سامنے اس لئے پیش کیا گیا کہ وہ غور و خوض کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچ سکیں"۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل والے جناب سید طفیل احمد کے قلم سے مقدمہ اور ڈاکٹر مقبول احمد کا پیش لفظ بھی ہے یہ دونوں تحریریں بجائے خود اہم اور کتاب کی روح تک پہنچنے میں معاون ہیں، دیوبند کے دو مفتیوں مولانا سید احمد علی سعید و مولانا ظفیر الدین کے فتوے بھی بطور ضمیمہ نقل کئے گئے ہیں، آیات و احادیث شریفہ کی تحقیق، حوالہ جات اور حواشی سے بھی یہ طبع نو مزین ہے، عام افادے کی غرض سے عربی اور انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ شایع کیا گیا ہے، ایک جگہ ایک عربی عبارت کا ترجمہ ناقص ہے، مصنف مرحوم کے ایک جامع سوانحی خاکے کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔

پنڈت آنند نرائن ملا (حیات اور شاعری) از جناب ڈاکٹر عبد الرشید ظہیری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۲، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) ۲۲۲ راؤز ایوینیو نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲-

پنڈت آنند نرائن ملا کی شخصیت گنگا جمنی تہذیب کا دل آویز نمونہ تھی، شعر و ادب اور قانون و سیاست دونوں میں وہ بہت ممتاز تھے، ان کا یہ جملہ یادگار بن گیا

ہے کہ "میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں"۔ ان کے متعدد شعری و نثری مجموعے شایع ہوے۔ لایق مصنف نے بڑی جامعیت اور سلیقے سے ملا صاحب کی شخصیت اور سخنوری کا مفصل جائزہ پیش کر کے قابلِ تحسین فریضہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے، ایک باب میں ملا صاحب کی نثری کاوشوں کا بھی احاطہ کیا گیا، اصلاً یہ تحقیقی مقالہ ہے جو پروفیسر محمود الٰہی اور پروفیسر احمر لاری جیسے فاضل اساتذہ کی نگرانی و ہدایت میں لکھا گیا، فہرست کتابیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ محنت و جستجو میں کمی نہیں اٹھا رکھی گئی، تحریر سادہ اور رواں ہے، البتہ یہ کہنا مبالغہ ہے کہ "کشمیریوں کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ من حیث القوم ہندوستان کا کوئی فرقہ اس قدر تیز فہم نہ ہوگا"۔ اخذ نتایج میں ظن و تخمین سے کام نہیں لینا چاہیے مثلاً "انھوں نے اندرا گاندھی کو مشورے دیے ہوں گے"، "کانگریس کا انتخابی نشان ان ہی کے ذہن کی پیداوار رہا ہو" وغیرہ، اس قسم کے جملے بھی گراں گذرتے ہیں کہ "ان کا نیچر ایمان میں بلیو نہیں کرتا"، قوسین میں بلیو کی انگریزی بھی درست نہیں۔

علمائے سلف اور نابینا علماء از جناب نواب صدر یار جنگ مرحوم، عمدہ کتابت و طباعت، صفحات ۴۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: مکتبہ ندویہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

نواب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے سو سال پہلے علمائے سلف اور نابینا علماء کے عنوان سے دو مختصر لیکن نہایت مفید و موثر مضامین پر مشتمل رسالے تحریر فرمائے تھے، ان کی تاثیر کا اعتراف کبار مشاہیر کو رہا، ایک زمانے سے یہ دونوں رسالے نایاب تھے اب دار العلوم ندوۃ العلماء کے ہشتکل کے طالب علموں نے ان دونوں کو یکجا شایع کر کے اپنے حسن ذوق اور سعادت مندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

زبور عجم (منظوم پنجابی ترجمہ) از جناب علی اکبر عباس، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور پاکستان۔

خلاصہ: اس میں زبور عجم کا منظوم ترجمہ فاضل مترجم کی فارسی اور پنجابی دونوں زبانوں پر قدرت کا مظہر ہے۔

ع۔ ص

تصانیف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

☆ اسوہ صحابہؓ: (حصہ اول) اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ قیمت ۵۰/روپے

☆ اسوہ صحابہؓ: (حصہ دوم) اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ قیمت ۵۶/روپے

☆ اسوہ صحابیاتؓ: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۲۰/روپے

☆ سیرت عمر بن عبدالعزیز: اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے۔ قیمت ۳۲/روپے

☆ امام رازی: امام فخرالدین رازی کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۴۵/روپے

☆ حکمائے اسلام (حصہ اول) اس میں یونانی فلسفہ کے ماخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ قیمت ۵۰/روپے

☆ حکمائے اسلام (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۳۰/روپے

☆ شعر الہند (حصہ اول) قدماء سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ۔ قیمت ۹۳/روپے

☆ شعر الہند (حصہ دوم) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ قیمت ۷۵/روپے

☆ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ قیمت ۸۰/روپے

☆ تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔ قیمت ۱۲۵/روپے

☆ انقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاء پردازانہ ترجمہ۔ (زیر طبع)

☆ مقالات عبدالسلام: مولانا مرحوم کے اہم ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۶۰/روپے